اسلام دین فطرت

مولانا وحیدالدین خاں

مکتبہ الرسالہ
سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

فہرست

اشاعت اوّل ۱۹۷۹ اشاعت دوم ۱۹۸۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کوئی آدمی دولت کے لئے جیتا ہے، کوئی عزت کے لئے، کوئی اقتدار کے لئے۔ ہر آدمی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کسی نہ کسی چیز میں جی رہا ہے۔ ہر آدمی کی زندگی میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کے سہارے وہ زندہ ہو۔ جس کو وہ سب سے زیادہ قابل لحاظ سمجھے۔ جس کو حاصل کرنے کا خواب دیکھے۔ جس کے لئے دوڑ دھوپ کرے۔ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے، اس کی تمنائیں اور اس کی حسرتیں سب سے زیادہ اس سے وابستہ ہوں۔ اس کو پاکر وہ سب سے زیادہ خوش ہو اور اس کے چھننے کا ڈر ہو تو وہ سب سے زیادہ غمگین ہو جائے۔

یہی دین ہے۔ اس معنی میں ہر شخص کا ایک دین ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص اس قسم کے ایک دین سے خالی نہیں۔ آدمی جس چیز کو اپنا "دین" بنائے اسی کے مطابق اس کی پوری زندگی بنتی ہے۔ اس کی سوچ اور جذبات، اس کا لین دین، اس کے انسانی تعلقات، اس کی سرگرمیاں اور کارروائیاں سب اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ اس کام کو کرتا ہے جس سے اس کا مقصود ملنے والا ہو، اس کام سے دور بھاگتا ہے جس سے اپنے مقصود کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو۔ یہی دین اس کا حاکم ہوتا ہے۔ سوتے جاگتے ہر حال میں وہ اسی دین کو پکڑے رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ اس کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔

یہ دین خدا کا بھی ہو سکتا ہے اور غیر خدا کا بھی۔ موجودہ دنیا میں یہی امتحان ہے کہ آدمی کون سا دین اختیار کرتا ہے۔ خدا کا یا غیر خدا کا۔ یہاں ہر شخص کو آزادی ہے۔ یہاں غیر خدا کے دین کو پکڑ کر بھی آدمی عزت اور کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر یہ کامیابی بالکل وقتی ہوگی۔ وہ زیادہ سے زیادہ موت تک آدمی کا ساتھ دے گی اس کے بعد اگلی مستقل دنیا میں وہ اس حال میں اٹھے گا کہ وہ بالکل خالی ہاتھ ہوگا۔ اگلی دنیا میں خدا اپنے قدرت اور جلال کے ساتھ ظاہر ہو چکا ہوگا۔ اس لئے وہاں عزت و کامیابی صرف اس شخص کے لئے ہوگی جس نے موجودہ دنیا میں خدا کے دین کو اپنا دین بنایا ہوگا۔ جو کسی دوسرے دین کو اختیار کرے گا، اس کے لئے موت کے بعد آنے والی دنیا میں ناکامی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

خدا کا دین ہی انسان کے لئے فطری اور حقیقی دین ہے۔ یہ حقیقت ڈر کے لمحات میں کھل جاتی ہے۔ آدمی خواہ کوئی بھی دین اختیار کرے۔ خواہ وہ کوئی بھی سہارا پکڑے۔ مگر جب انسان کی زندگی کا جہاز کسی بھنور میں پھنستا ہے جب اس پر کوئی نازک لمحہ آجاتا ہے، اس وقت اس کو تمام چیزیں بھول جاتی ہیں۔ اس وقت وہ بے اختیار ہو کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ یہ تجربہ جو کبھی نہ کبھی ہر شخص کی زندگی میں گزرتا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حقیقی دین صرف خدا کا دین ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اسی کو اپنی زندگی کا دین بنائے۔ اس کے سوا وہ جس دین کو بھی پکڑے گا وہ وقت آنے پر اسی طرح بے حقیقت ثابت ہوگا جیسے آج نازک لمحات میں تمام چیزیں بے حقیقت ثابت ہو جاتی ہیں۔ آج کے حالات میں فطرت کی پکار آئندہ آنے والی مستقل دنیا کا ایک اشارہ ہے۔ وہی شخص کامیاب ہے جو اس اشارہ پر کان لگائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنالے۔

آدمی کا امتحان

پہلا انسان جو خدا نے پیدا کیا وہ آدم تھے۔ اس وقت خدا کی پیدا کی ہوئی دو مخلوقات اور تھیں۔ ایک فرشتے دوسرے جن۔ خدا نے فرشتوں اور جنوں کو حکم دیا کہ تم سب آدم کے آگے سجدہ کرو۔ فرشتے خدا کا حکم سنتے ہی سجدہ میں گر پڑے۔ مگر ابلیس، جو جنوں کا سردار تھا، اس نے سجدہ نہیں کیا۔ خدا نے کہا: تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا جب کہ میں نے اس کا حکم دیا تھا۔ ابلیس بولا: میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے آدم کو مٹی سے بنایا ہے اور مجھ کو آگ سے (اعراف ۱۲) ابلیس خدا کو سجدہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر وہ آدم کو سجدہ کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملعون اور جہنمی قرار دے دیا گیا۔

یہی معرکہ آدم کی اولاد میں آج بھی جاری ہے۔ ایک طرف فرشتے ہیں جو آدمی کو تسلیم اور اعتراف کا سبق دے رہے ہیں۔ دوسری طرف ابلیس ہے جو انسان کی رگوں میں تیرتا ہے اور آدمی کو اکساتا ہے کہ وہ خود پسندی (انا خیر منہ) کا طریقہ اختیار کرے اور اس کا ہم مسلک بن جائے۔ اس طرح ہماری زندگی میں دوبارہ بہت بڑے پیمانہ پر وہی کہانی دہرائی جا رہی ہے جو پہلے انسان کی پیدائش کے وقت ابتداءً پیش آئی تھی۔ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہم کبھی نہ کبھی ایک "آدم" سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہمارا سابقہ کسی نہ کسی انسان سے پڑتا ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی حق ہمارے اوپر عائد ہوتا ہے، خواہ وہ ایک اچھے بول کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ ایسے ہر موقع پر خدا اپنی خاموش زبان میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ میرے حکم کی تعمیل میں اس آدم کے سامنے جھک جاؤ۔ اب جو لوگ فرشتوں کی روش کو اختیار کریں اور اپنے بارے میں خدا کے حکم کو پہچان کر اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دیں، وہ خدا کے وفادار بندے ہیں۔ وہ ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔ اور جو لوگ ابلیس کے طریقے کو اختیار کریں اور اپنی بڑائی کی خاطر دوسرے کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوں، وہ خدا کے باغی لوگ ہیں۔ وہ ابلیس کے ساتھ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے تاکہ وہاں ابدی طور پر جلتے رہیں:

> شیطان بولا: جیسا تو نے مجھے بدراہ کیا ہے، میں تیری سیدھی راہ پر انسانوں کی تاک میں بیٹھوں گا۔ میں ان پر آؤں گا آگے سے اور پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے۔ اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ اللہ نے کہا: نکل یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر۔ ان میں سے جو کوئی تیری راہ چلا تو میں تم سب سے دوزخ کو بھر دوں گا (اعراف ۱۸-۱۶)

انسان خدا کا بندہ ہے۔ اس کو اصل سجدہ خدا ہی کو کرنا ہے۔ مگر دنیا کی زندگی میں وہ جن لوگوں کے درمیان رہتا ہے، ان کے مقابلہ میں بار بار اس پر کسی نہ کسی کا حق آتا ہے اور بار بار خدا کا حکم ہوتا ہے کہ یہاں تم اس "آدم" کے سامنے جھک جاؤ۔ یہی آدمی کا اصل امتحان ہے۔ خدا کو سجدہ کرنے کے لئے آدمی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ مگر جہاں اس کو کسی انسان کا اعتراف کرنا ہو، جہاں کسی انسان کے سامنے جھکنے کا سوال ہو وہاں فوراً

اس کے اندر ابلیس والی نفسیات جاگ اٹھتی ہیں۔ "میں اس سے بہتر ہوں، میں کیوں اس کے سامنے جھکوں" یہ احساس، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ وہ جس خدا کو سجدہ کر رہا ہوتا ہے، اس خدا کے حکم کے باوجود "آدم" کے آگے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔

دو آدمیوں کے درمیان ایک معاملہ پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں ایک حق پر ہوتا ہے اور دوسرا ناحق پر۔ جو شخص حق پر ہے وہ گویا دوسرے شخص کے لئے وقت کا "آدم" ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان اس صورت حال کا پیدا ہونا ہی خدا کا یہ حکم آجانا ہے کہ میرے بنائے ہوئے اس آدم کے سامنے میری خاطر جھک جاؤ۔ اب جو شخص اپنے حریف کے حق کو مانتے ہوئے اس کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دے، اس نے فرشتوں کی پیروی کی۔ اور جس شخص کے لئے اس کی "میں" حق کے اعتراف میں مانع ہو جائے، جو اس ذہن کے تحت حق دار کے سامنے جھکنے سے انکار کر دے کہ میری پوزیشن مضبوط ہے، یہ شخص میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، اس نے ابلیس کی پیروی کی۔ خدا کے سامنے سجدہ کرنا اس کی نجات کا سبب نہیں بن سکتا۔ خدا کے آگے سجدہ صرف اس شخص کا معتبر ہے جو خدا کے حکم کی تعمیل میں اس کے بنائے ہوئے "آدم" کے سامنے بھی جھکنے پر راضی ہو جائے۔ جو یہ کہے کہ میں خدا کے لئے سجدہ کروں گا مگر آدم کے سامنے نہیں جھکوں گا، وہ ابلیس کا بھائی ہے۔ اس کے سجدہ کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ اس نے "آدم" کے سامنے جھکنے سے انکار کر کے کبر کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور جو اپنے اندر کبر کی نفسیات کی پرورش کرے اس کا کوئی عمل خدا کبھی قبول نہیں کرتا۔

پہلے انسان (آدم) کا قصہ خدا کے سامنے براہ راست پیش آیا تھا۔ اب دنیا کی زندگی میں ہر آن یہی قصہ خدا کے غیب میں پیش آ رہا ہے۔ آج خدا ہمارے سامنے عیاناً موجود نہیں ہے۔ آج جو چیز خدا کی جگہ پر ہے وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کا طریقہ ہے اور اسی کے ساتھ آدمی کا اپنا ضمیر ہے جو اندر سے اس کو آواز دیتا ہے ہر روز جب کسی انسان سے ہمارا سابقہ پیش آتا ہے اور یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے حق کا اعتراف کریں، خواہ یہ تقاضہ لفظی اعتراف کا ہو یا کسی عمل کا، اس وقت گویا خاموش زبان میں خدا کا حکم ہمارے پاس آجاتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ اس "آدم" کا جو حق تمھارے اوپر آتا ہے اس کو ادا کرو۔ بالفاظ دیگر، اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اگر لفظی اعتراف کا معاملہ ہے تو لفظوں میں اس کی صداقت کا اعتراف کرو۔ اگر عملی حق کا معاملہ ہے تو عملی طور پر اس کا حق ادا کرو۔ ایسے موقع پر جو لوگ خدا کی خاموش آواز پر کان لگائیں اور فوراً اپنے آپ کو اس کی تعمیل کے لئے پیش کر دیں، وہ امتحان میں سچے اترے۔ اور جو لوگ "میرا درجہ بڑا ہے" "میں اس سے بہتر ہوں" "میں زیادہ طاقتور ہوں" جیسی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں اور اپنے "آدم" کے آگے جھکنے سے انکار کر دیں، وہ امتحان میں پورے نہیں اترے۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے فرشتوں والا انجام ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے ابلیس والا انجام۔ انسان سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ وہ خدا کے سامنے سجدہ کرے۔ مگر کوئی شخص حقیقۃً خدا کا ساجد بنا یا نہیں، اس کا امتحان اس کو "آدم" کے سامنے جھک کر دینا ہے۔ خدا کا ساجد اور عابد وہی ہے جو خدا کے

حکم کو مان کر اپنے حق دار انسان کے سامنے جھک جائے۔ جو شخص خدا کے سامنے سجدہ کرے اور جب انسان سے معاملہ پڑے تو اس کا حق نہ پہچانے اور گھمنڈ اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے، وہ خدا کا ساجد بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ جہاں اس کا خدا اس کے ساجد ہونے کا امتحان لے رہا تھا وہاں وہ اپنے آپ کو ساجد ثابت نہ کر سکا۔

خدا کو سجدہ کرنے کے لئے آدمی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کے مقابلہ میں کسی کے اندر "میں اس سے بڑا ہوں" کی نفسیات نہیں ہوتی۔ جب کہ انسان کے مقابلہ میں طرح طرح کی نفسیاتی گرہیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں جو ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کے اعتراف میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ خدا کسی انسان کا حریف نہیں۔ جب کہ ایک انسان بہت جلد دوسرے انسان کو اپنا حریف سمجھ لیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں جھکنے کو اپنے لئے عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ خدا کے مقابلہ میں آدمی کی نفسیات احتیاج کی نفسیات ہوتی ہے۔ خدا صرف دینے والا ہے۔ اس کو کسی سے لینے کی ضرورت نہیں۔ مگر انسان کا معاملہ مختلف ہے۔ یہاں جب ایک شخص دوسرے شخص کے سامنے جھکتا ہے تو وہ اس کو کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ کبھی اچھے الفاظ، کبھی دوسرے کی حقانیت کا اعتراف، کبھی اس کا مالی یا مادی حق ادا کرنا، کبھی کسی کو افضل پا کر خود پیچھے ہٹ جانا اور اس کو آگے بڑھانا، کبھی کسی کی کمزوری پر قابو پا لینے کے باوجود اس کی عزت کی خاطر اس سے درگزر کرنا۔ کبھی ایک شخص کی اتفاقی غلطی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہوتے ہوئے انصاف کی خاطر چپ رہ جانا۔ کبھی سامنے کے ملتے ہوئے نفع کو چھوڑ کر صرف اصول کی خاطر بے نفع والے آدمی کا ساتھ دینا، غرض ہر بار جب کسی کے لئے دوسرے آدمی کے سامنے جھکنے کا سوال ہو تو یہ اس کو کچھ دینے کا سوال ہوتا ہے۔ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے مقابلہ میں حق و انصاف کا رویہ اختیار کرنے کے لئے اس کو اپنی نفسیاتی گرہوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ جب وہ کسی حریف کی عزت کرتا ہے تو یہ اپنی عزت کو خطرہ میں ڈالنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ یہ چیزیں خدا کے سجدہ کے مقابلہ میں "آدم" کے آگے جھکنے کو کسی انسان کے لئے بے حد مشکل بنا دیتی ہیں۔ مگر انسان کا اصلی امتحان جہاں ہو رہا ہے، وہ یہی مقام ہے۔ یہی وہ اصل قربانی ہے جو ہر ایک کو اپنے خدا کی رضا کے لئے دینی ہے۔ جو اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی خدا کا محبوب بندہ نہیں بن سکتا۔ خواہ وہ بظاہر خدا کو سجدہ کرنے والا ہو یا سجدہ نہ کرنے والا۔

سب سے بڑی حقیقت اللہ رب العالمین ہے۔ اس ذات کو پا لینا ہی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی جہاں اپنے رب کو پاتا ہے وہ "سجدہ" ہے، مگر سجدہ اسی وقت حقیقی سجدہ بنتا ہے جب کہ سجدہ سے باہر کی دنیا میں آدمی تواضع اور جھکاؤ کی زندگی اختیار کر چکا ہو۔ ایسا شخص اپنی نفسی حالت کے اعتبار سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی تجلیات کا آخذ (Recipient) بن سکے۔ اس کے لئے سجدہ حقیقی معنوں میں رب العالمین سے ملاقات کا مقام بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص سجدہ سے باہر کی زندگی میں خود پسند اور متکبر بنا رہے، اس کی روح کے اندر شیطان اپنے گھونسلے بنا لیتا ہے۔ اس کا سجدہ غفلت اور بے کیفی کا سجدہ ہوتا ہے۔ اس کا سجدہ اس کو خدا سے نہیں ملاتا، اس کا سجدہ اس کو خدا سے قریب نہیں کرتا۔

توحید کا تصور اسلام میں

کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس نے اپنے منصوبہ کے مطابق اس کو بنایا ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔ جس طرح ساری کائنات خدا کی اطاعت کر رہی ہے اسی طرح انسان کے لئے بھی صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کا فرماں بردار بن کر زندگی گزارے۔ تمام انبیاء یہی بتانے کے لئے آئے اور کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ہر آن آدمی کو یہی سبق دے رہی ہے ——— یہ ہے اسلامی توحید اور اس مقالہ میں مجھ کو اسی نظریۂ توحید کی وضاحت کرنی ہے۔

"کیا تمہیں شک ہے اللہ کے بارے میں جس نے زمین و آسمان کو پھاڑا (ابراہیم ۱۰) قرآن کا یہ ارشاد بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقۃً وہ سوال کا جواب ہے۔ اس آیت میں فاطر (پھاڑنے والا) کا لفظ وجود خداوندی کے حق میں ایک قطعی دلیل ہے جس کو دوسرے مقام پر ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے "کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا کر دیا (انبیاء ۳۰) اندازہ کیا گیا ہے کہ کائنات کا موجودہ دائرہ (Radius) کم از کم دس ہزار ملین سال نور ہے۔ فلکیاتی مطالعہ نے بتایا ہے کہ کائنات ایک حالت پر ٹھہری ہوئی نہیں ہے بلکہ یکساں رفتار سے اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی میں کسی وقت کائنات سمٹی ہوئی حالت میں تھی۔ فلکیات والوں کے خیال کے مطابق ابتداءً پوری کائنات ایک بڑے ایٹم (Super Atom) کی صورت میں تھی۔ اس کے تمام اجزاء بے حد قوت کے ساتھ اندر کی طرف کھنچے ہوئے تھے۔ تقریباً پندرہ بلین سال پہلے اس ابتدائی مادہ میں ایک دھماکہ یا اخراج طاقت (Energy Release) کا واقعہ ہوا جس کے نتیجہ میں سپر ایٹم کے اجزا اپنے مرکز سے ٹوٹ کر اپنے چاروں طرف پھیلنے لگے تاکہ موجودہ کائنات کو وجود دے سکیں۔ سپر ایٹم کے اندر اس وقت جو اسباب کام کر رہے تھے وہ تمام تر صرف اندر کی طرف کھینچنے اور سمٹنے کے تھے۔ اپنے ذاتی قانون کے برخلاف اس کے اجزاء کا باہر کی طرف سفر شروع کرنا لازماً کسی خارجی طاقت کی مداخلت ہی سے ہو سکتا تھا۔ یہ واقعہ ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم کائنات کے ماسوا ایک آزاد ہستی کا وجود تسلیم کریں جو تمام طاقتوں کی مالک ہے اور جس نے اپنے شعوری عمل سے ابتدائی مادہ کے اندر یہ غیر معمولی حرکت پیدا کی۔

"زمین و آسمان میں اگر ایک خدا کے سوا کوئی اور خدا ہوتا تو ضرور ان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا (انبیاء ۲۲) قرآن کے یہ الفاظ اس کائناتی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہ مافوق طاقت صرف ایک ہے، کئی نہیں۔ تمام طبیعی علوم حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ پوری کائنات ایک ہی قانون کے تحت چل رہی ہے۔ جو قوانین زمین پر کام کر رہے ہیں، وہی نہایت صحت کے ساتھ اجرام سماوی میں بھی کارفرما ہیں۔ یہی یقین تھا جس نے انسان کو آمادہ کیا کہ وہ کھربوں ڈالر خرچ کر کے خلائی مشینیں بنائے اور ان کو چاند اور مریخ پر عین اپنے اندازہ کے مطابق اتار سکے۔ اگر ساری کائنات ایک قانون کے تحت مکمل صحت کے ساتھ عمل نہ کر رہی ہو تو زمین پر

لگی ہوئی ہماری دوربینیں وسیع کائنات میں آٹھ ہزار ملین سال نور تک نہ "دیکھ" سکیں۔ ہمارے طبیعی علوم اچانک اپنی تمام اہمیت کھودیں۔ کائنات کا اس قدر درست طور پر وحدانی حالت میں ہونا بتاتا ہے کہ وہ صرف ایک خدا کے کنٹرول میں ہے۔ اگر وہ کئی خداؤں کے کنٹرول میں ہوتی تو یقیناً اس میں انتشار برپا ہو جاتا۔ مختلف خداؤں کی کش مکش میں وہ درہم برہم ہو کر رہ جاتی۔ زمین پر ایک قانون کی حکمرانی ہوتی اور سیاروں پر دوسرے قانون کی۔

"اللہ نے پیدا کی ہر چیز اور پھر ہر ایک کا ایک اندازہ مقرر کر دیا (فرقان ۲) طبیعیاتی مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا ایک قانون ہے اور وہ انتہائی لزوم کے ساتھ اس پر قائم ہے۔ آئی رکسبرگ (پروفیسر تطبیقی ریاضیات کوئن میری کالج لندن) کے الفاظ میں "کائنات تعجب خیز حد تک یکساں (Uniform) ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزاء میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کئے گئے ہیں، وہ تحکمی اعداد (Arbitrary Numbers) پر مشتمل ہیں۔ جیسے الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ (Mass) سے، جو کہ تقریباً 1840 کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر (Arbitrarily) انہیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے" (سنڈے ٹائمس لندن ۴ دسمبر ۱۹۷۷) یہ واقعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ کائنات ہر آن ایک زبردست ہستی کے کنٹرول میں ہے۔ جو خدا کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا حکمراں بھی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ ــ "خدا اگر ہے تو ہم کو نظر کیوں نہیں آتا"۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ چیزوں کو دیکھے بغیر مانیں۔ یہ صرف خدا کے عقیدہ کا سوال نہیں ہے۔ ہم جس کائنات میں ہیں اور جس کو ہم بہر حال مانتے ہیں، اس میں بے شمار چیزیں ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے اور نہیں دیکھ سکتے۔ مگر اس کے باوجود ہم ان کو ماننے پر مجبور ہیں۔ خدا کے سوا موجودہ کائنات کو بھی ہم ایمان بالغیب کا طریقہ اختیار کئے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ مثال کے طور پر ایٹم میں کئی قسم کے ذرات (Particles) تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نیوٹرینو (Neutrino) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ذرہ میں کوئی برقی چارج نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس میں کوئی مادہ (Mass) بھی نہیں ہوتا۔ گویا وہ ایک لاشئے وجود ہے۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں :

Neutrino is a tiny bundle of nothing (3.1.1979)

نیوٹرینو لاشئے کا ایک چھوٹا سا پلندہ ہے۔ اس لاشئے کا وجود کیوں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایٹم میں بعض ایسے خواص ظاہر ہوتے ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں بنتی کہ ایٹم کے ڈھانچہ میں ایک غیر ذرہ (Non-Particle) کا وجود تسلیم کیا جائے۔ اس مفروضہ نیوٹرینو کے عجیب وغریب اوصاف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی مادی جسم سے بغیر روک ٹوک گزر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے سفر میں پورے کرہ ارض کو اس کے اندر سے پار کر سکتا ہے۔ نیوٹرینو کی اس خصوصیت کو انسانی استعمال میں لانے کے لئے امریکہ میں تجربات ہو رہے ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر نیوٹرینو کی اس خصوصیت کو قابل استعمال بنایا جا سکا تو پیغام رسانی کی دنیا میں انقلاب آجائے گا ـــــــ

کائنات میں کسی چیز کو "دیکھنا" خالص علمی طور پر اس قدر ناممکن ہے کہ سائنسی فلاسفہ کے درمیان خود اس امر میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ وہ کائنات کو ایک خارجی (Objective) واقعہ قرار دیں یا محض ایک ذہنی یا داخلی (Subjective) طور پر محسوس کی جانے والی چیز۔

خدا کو ماننا کبھی انسان کے لئے اتنا مشکل نہیں رہا ہے جتنا خدا کا صحیح تصور قائم کرنا۔ تمام معلوم زمانوں سے انسان خدا کو مانتا رہا ہے اور آج بھی کرۂ ارض کی آبادی کی بہت بڑی اکثریت خدا کے وجود کا اقرار کرتی ہے۔ مگر اصل کمی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ خدا کو ماننے کے باوجود لوگ اس کے ساتھ ایسے عقیدے جمع کر لیتے ہیں جس سے ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہو جاتا ہے۔ کسی نے خدا کو مانتے ہوئے اس کی ایسی تعبیر کی کہ خدا کا کوئی علیحدہ اور مستقل وجود ہی مشتبہ ہو گیا۔ کسی نے خدا کو مانا مگر اسی کے ساتھ اس کے ایسے شرکا یا مقربین بارگاہ فرض کر لئے جس کے بعد خدا کی خدائی بے معنی ہو کر رہ گئی۔

خدا کے معاملہ میں انسان کے بے راہ ہونے کی وجہ ہمیشہ صرف ایک رہی ہے۔ کائنات کے معلوم واقعات پر خدا کو قیاس کرنا ——— انسان کے یہاں بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں، اس لئے فرض کر لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ بیٹے بیٹیاں ہوں گی۔ اور اس طرح ایک مقدس خدائی خاندان تیار ہو گیا۔ دنیا کے بادشاہوں کے یہاں کچھ سرکاری لوگ ہوتے ہیں، اس لئے فرض کر لیا گیا کہ خدا کے یہاں بھی کچھ مقرب لوگ ہیں جن کو اس نے اختیار دے رکھا ہے اور جن کی باتوں کو وہ سنتا ہے۔ اس طرح خاصان کائنات کا ایک قبیلہ تیار ہو گیا۔ دنیا میں بہت سی طاقتیں کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ مثلاً سورج، ستارے، دریا وغیرہ۔ فرض کر لیا گیا کہ یہ سب خدائی میں شریک ہستیاں ہیں اور بڑے خدا کے ساتھ مل کر خدائی کو چلا رہی ہیں۔ اس طرح خدا کا معاملہ ایک قسم کا "مشترک کاروبار" کا معاملہ بن گیا، وغیرہ

مظاہر پرستی کی یہی قسم تھی جس نے فلسفیانہ ذہنوں میں پہنچ کر وحدت وجود کی صورت اختیار کی۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک کائنات ہے جو انسان سے لے کر ستاروں تک بے شمار چیزوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ اس تنوع میں وحدت تلاش کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک مطلق خدا ہے جو اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ظاہر کر رہا ہے۔ اس طرح خدا کا تصور ایک ایسے مجرد خیال کی صورت میں ڈھل گیا جس کی اپنی علیحدہ کوئی ہستی نہ ہو۔ ہر چیز اسی سے نکلتی ہو اور ختم ہو کر دوبارہ اس میں مل جاتی ہو۔ اسی تصور نے "انسانی خداؤں" کا عقیدہ پیدا کیا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ کچھ لوگ اپنی ریاضتوں سے اپنی دنیوی حیثیت کی اس طرح نفی کر دیتے ہیں کہ وہ جیتے جی خدا سے مل جاتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی ہی میں اس خدا کا جزء بن جاتے ہیں جس کا جزء دوسرے لوگ مرنے کے بعد، ان کے عقیدہ کے مطابق، بننے والے ہیں

اسلام نے خدا کے تصور سے ان تمام الحاقات کو جدا کیا۔ اس نے بتایا کہ اس طرح کا ہر اضافہ دراصل خدا کے عقیدہ کی نفی ہے۔ خدا وہی خدا ہے جو ہر لحاظ سے یکتائی کی صفت رکھتا ہو۔ جو اپنی ذات و صفات میں اشتراک

کی تمام قسموں سے پوری طرح پاک ہو۔ "کہہ دو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے احتیاج ہے۔ اس کے اولاد نہیں۔ نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور نہیں ہے اس کے برابر کوئی (اخلاص)

توحید کی عملی اہمیت

اسلام میں توحید کا عقیدہ ہیگل کے فلسفہ کی طرح محض ایک مجرد تصور (Abstract Idea) کی حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان کی زندگی سے اس کا نہایت گہرا عملی تعلق ہے۔ اسلام کے نزدیک وہی شخص موحد ہے جو وحدت فکر کے ساتھ وحدت کردار کا بھی حامل بن جائے۔ اسلامی توحید کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کائنات کا خالق ایک ہے اسی طرح اس کا مالک بھی ایک ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح وہ ہستی بھی وہی ایک ہے جس کے آگے انسان جواب دہ ہے اور اپنے عمل کے مطابق جس کے یہاں سزا یا جزا پانے والا ہے۔ اس طرح آخرت کا عقیدہ بھی، بالواسطہ طور پر، عقیدۂ توحید ہی کا ایک جزء بن جاتا ہے۔ خدا کے تخلیقی ظہور کو ماننے بغیر جس طرح خدا کا عقیدہ بے معنی ہے، اسی طرح خدا کے محاسب اور مجازی ہونے کی حیثیت کو جب تک تسلیم نہ کیا جائے، خدا کی یکتائی کا عقیدہ مکمل نہیں ہوتا۔ موجودہ کائنات اپنی اتھاہ حکمتوں کے ساتھ خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرت کاملہ کا ایک ظہور ہے۔ آخرت کا عالم اسی ظہور خداوندی کی تکمیل ہے۔ موجودہ دنیا وحدتِ الٰہی کا غیبی ظہور ہے، آخرت کی دنیا وحدتِ الٰہی کا مشاہداتی ظہور۔ موجودہ عالم میں توحید ایک غور و فکر کا موضوع نظر آتی ہے، آخرت کی دنیا وہ دنیا ہوگی جہاں توحید ایک ایسا قائم شدہ واقعہ بن جائے گا جس کو ماننا اسی طرح ہر ایک کے لئے ضروری ہوگا جس طرح آج سورج کو ماننا۔ اگر کوئی شخص خدا کو ایک مانے مگر خدا کی یکتائی کے اس ظہور کو تسلیم نہ کرے جو آخرت کی صورت میں سامنے آنے والا ہے تو اس کا عقیدۂ توحید ناقص ہے۔ وہ ایک فلسفی موحد ہو سکتا ہے مگر اس کو اسلامی موحد کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔

"خدا ایک ہے"، یہ صرف ایک گنتی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ تمام معلوم اور نامعلوم حقائق کی تشریح کا معاملہ ہے۔ مادی دنیا ہو یا روحانی دنیا، حال کا معاملہ ہو یا مستقبل کا معاملہ، دنیا کے مسائل ہوں یا آخرت کے مسائل، تمام چیزیں اس وقت تک ناقابل فہم ہیں جب تک ان کو ایک فکری وحدت کی حیثیت نہ دے دی جائے، جب تک وحدتِ خداوندی کے ساتھ ان کی نسبت کو معلوم نہ کر لیا جائے۔ خدا کی یکتائی کی دریافت تمام حقائق کی مرکزی وحدت کی دریافت ہے۔ وہی توحید توحید ہے جو ہمارے اوپر حقائق کی ابدی معنویت کو واضح کر دے۔ جو نظریہ حقائق کی معنویت کو بحیثیت ایک کل کے واضح نہ کرے وہ خواہ اور جو کچھ ہو مگر اسلامی نقطۂ نظر سے اس کو توحید نہیں کہا جا سکتا۔ خدا کی وحدت کو پانا اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب کہ وہ اسی کے ساتھ انسان اور کائنات کی وحدت کو پانے کے ہم معنی بن جائے، وہ ایک ایسے فکر کا درجہ حاصل کرے جہاں تمام تضادات ختم ہو جائیں اور صرف وحدت ہی آخری حقیقت کے طور پر باقی رہ جائے۔ ڈارون نے خالق (Creator) کا وجود تسلیم کیا ہے۔ مگر وہ یہ دریافت نہ کر سکا کہ خالق ہے تو اس کے اور انسان کے درمیان نسبت کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈارون کے نظریہ کے بطن سے تاریخ کا سب سے زیادہ شدید

الحاد برآمد ہوا۔ توحید کے عقیدہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ضروری ہے کہ توحید کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ وہ ہم کو توحید اور انسان کے درمیان نسبت کی دریافت تک پہنچا سکے۔ اس کے بغیر نہ صرف یہ کہ یہ مطالعہ ادھورا رہیگا بلکہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ سچائی کے مسافر کو الٹی سمت میں کسی مقام پر پہنچانے والا بن جائے۔

توحید کا عقیدہ اور انسان

کائنات جس طرح مکمل طور پر اپنے خالق اور مالک کے تابع ہے، وہی انسان سے بھی مطلوب ہے جو کائنات کا صرف ایک حقیر حصہ ہے۔ انسان کے لئے درست طرز عمل صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کرے اور خدا کی اطاعت کو قبول کر کے بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔ خدا جس طرح ساری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اسی طرح انسان کے معاملات بھی اسی وقت سدھر سکتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو خدائی کنٹرول میں دے چکا ہو۔ کائنات کی صحت کارکردگی کا سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خدائی اخلاقیات کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ انسانی زندگی کی درستگی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ خدائی اخلاقیات میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کرے۔

توحید تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔ اور ہر قسم کی خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ توحید دنیا میں قائم نہ ہو۔ توحید کیا ہے۔ اس حقیقتِ واقعہ کا تحقق کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا، اس کو سنبھالنے والا اور ہر قسم کی قوتوں کا واحد مالک صرف ایک اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو اس کائنات میں کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ذرہ سے لے کر کہکشانی نظاموں تک سارا عالم اس حقیقتِ توحید کی براہ راست گرفت میں ہے۔ وہ مکمل طور پر ایک مالک الملک کے زیر انتظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورا عالم اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ٹھیک ویسا ہی ہے جیسا کہ فی الواقع اس کو ہونا چاہئے۔ اس کی کارگزاری میں آج تک کسی ادنیٰ نقص کا مشاہدہ نہ کیا جا سکا۔ وہ اتنی کامل صحت کے ساتھ چل رہا ہے کہ کھرب ہا کھرب سال کے اندر بھی اس کی رفتار میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں پڑتا۔

موجودہ زمانہ میں خدا کے وجود کے خلاف جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں، ان میں سب سے اہم وہ ہے جس کو نقص کا مسئلہ (Problem of Evil) کہا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کائنات میں ایسے نقائص ہیں جن کی موجودگی میں یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو کسی حکمت والے خدا نے بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک شخص نے یہ مثال دی ہے کہ زمین کی قوت کشش (Force of Gravity) اس سے بہت زیادہ ہے جتنا کہ اس کو ہونا چاہئے۔ چنانچہ چند میٹر کی بلندی سے گرنے میں آدمی کا پاؤں ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر قوت کشش کم ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ مگر اس قسم کی بات صرف کمتر غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ کہنے والا یہ بھول گیا کہ گرنا تو ایک حادثہ ہے جو معمول کے خلاف کبھی پیش آتا ہے۔ لیکن اگر زمین کی قوت کشش کم ہوتی تو اس پر معمول کی زندگی ہی درہم برہم ہو جاتی ـــــ انسان مضبوطی کے ساتھ زمین پر قائم نہ رہ سکتا، ہماری ریلیں پٹریوں پر نہ دوڑ سکتیں، ہمارے مکانات اور کارخانے اکھڑ جاتے، پانی زمین پر نہ ٹھیر سکتا، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز جس کو بعض لوگوں نے نظام فطرت کا نقص سمجھا ہے وہ نظام فطرت میں اعتدال و توازن کا ثبوت ہے۔ قرآن کے یہ الفاظ ناقابل چیلنج حد تک صحیح ہیں " اللہ نے بنائے سات آسمان،

اوپر تلے۔ تم اللہ کے اس بنانے میں کوئی فرق نہ دیکھو گے۔ تم پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو۔ کیا تم کو کوئی خلل دکھائی دیتا ہے۔ بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو۔ تمھاری نگاہ عاجز ہو کر اور تھکی ہوئی تمھاری طرف لوٹ آئے گی (ملک)

کائنات کا اس طرح بے عیب اور خالی از نقص ہونا اس لئے ہے کہ وہ براہ راست خدا کے کنٹرول میں ہے۔ وہ خدا کی صفات کا مادی ظہور ہے۔ مگر انسانی دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اینٹن چیخوف نے صحیح کہا ہے کہ "یہ دنیا بے حد حسین ہے۔ اس میں صرف ایک ہی چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے"۔ انسان ساری معلوم کائنات میں واحد مخلوق ہے جو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ عداوت کرتا ہے (بقرہ ۳۶) وہ زمین پر اصلاح کے بجائے فساد برپا کرتا ہے (اعراف ۵۶) وہ ایسی کارروائیاں کرتا ہے جس کے نتیجہ میں کھیتیاں اور نسلیں برباد ہوں (بقرہ ۲۰۵)۔ دو دنیاؤں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ کائنات براہ راست اللہ کے حکم کے تحت چل رہی ہے۔ وہ ویسی ہی رہنے کے لئے مجبور ہے جیسی کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ رہے۔ مگر انسان کو اللہ طرف سے آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ارادہ کے تحت صحیح یا غلط راستہ پر چلنے کا اختیار رکھتا ہے۔ انسانی دنیا میں بگاڑ کی وجہ تمام تر یہی ہے۔ بقیہ دنیا خدا کی مرضی کی پابند ہے، اس لئے وہ مکمل طور پر درست ہے۔ اس کے برعکس انسان اپنی خواہشوں کی پیروی کرتا ہے، اس لئے اس کے سارے معاملات میں فساد اور بگاڑ برپا رہتا ہے۔ ہر برائی جو زمین پر پائی جاتی ہے وہ انسانی آزادی کا غلط استعمال ہے۔ انسان نے فرشتوں کے اس اندیشہ کو ساری تاریخ میں درست ثابت کیا ہے جو انھوں نے اس کی پیدائش کے وقت خدا کے سامنے ظاہر کیا تھا: "کیا تو ایسے لوگوں کو زمین میں اختیار دے رہا ہے جو وہاں فساد کرے اور خون بہائے (بقرہ ۳۰)

یہ آزادی جو انسان کو حاصل ہے، یہ مطلق آزادی نہیں ہے۔ یہ صرف وقتی آزادی ہے اور خاص منصوبہ کے تحت دی گئی ہے۔ یہ دراصل امتحان کی آزادی ہے (ملک ۲) کائنات کا مالک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو آزادی پا کر بھی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرتا۔ تاکہ وہ ایسے لوگوں کو اپنے انعامات سے نوازے۔ اور ان لوگوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے جو آزادی پا کر بگڑ گئے (انفال ۳۷) دنیا کا موجودہ نظام صرف اس وقت تک ہے جب تک جانچ کا یہ عمل پورا نہیں ہو جاتا۔ اس مدت کے پورا ہونے کے بعد زمین کا مالک زمین کا انتظام بھی براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لے گا جس طرح وہ بقیہ کائنات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ (مریم ۴۰) اس وقت اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دیئے جائیں گے (آل عمران ۱۷۹) اچھے لوگوں کو ابدی طور پر جنتی زندگی حاصل ہوگی اور برے لوگ ابدی طور پر جہنمی حالات میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ موجودہ دنیا وہ مقام ہے جہاں آنے والی خدائی دنیا کے شہری چنے جا رہے ہیں۔ جو لوگ آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے آپ کو اللہ کا حکم بردار بنائیں گے، جو مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کی مرضی کو اپنے اوپر طاری کریں گے، وہی اللہ کے نزدیک اس قابل ٹھیریں گے کہ وہ اللہ کی دنیا کے شہری بن سکیں۔ آج امتحان کے وقفہ میں ہر طرح کے لوگ زمین پر بسے ہوئے ہیں۔ مگر امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد صرف صالح لوگ خدا کی اس ہری بھری دنیا کے وارث

قرار پائیں گے (انبیاء ۱۰۵) اور بقیہ لوگوں کو اس سے بے دخل کر کے دور پھینک دیا جائے گا۔

قرآن اور کائنات

آنے والی جنتی دنیا کا شہری بننے کے لئے کس قسم کی صلاحیتیں درکار ہیں، اس کے جواب کو خدا نے مبہم نہیں رکھا بلکہ اس کو انتہائی واضح طور پر بتا دیا ہے۔ بولنے والی زبان میں یہ جواب قرآن میں موجود ہے اور خاموش زبان میں وہ کائنات میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ توحید کو انسانی زندگی میں قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان بھی اسی آفاقی دین کو اپنائے جس کو ہمارے گرد و پیش کی ساری کائنات اپنائے ہوئے ہے۔ "کیا وہ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور سب اللہ ہی کی طرف پھیرے جائیں گے" (آل عمران ۸۳) قرآن کے اس بیان کے مطابق کائنات بالفعل اس دین توحید کو اپنائے ہوئے ہے جس کو اپنانے کا مطالبہ انسان سے کیا جا رہا ہے۔ کائنات دین توحید کا عملی نمونہ ہے۔ کائنات میں ہم اس دین کو "دیکھ" سکتے ہیں جس کو ہم خدا کی کتاب میں "پڑھ" رہے ہیں۔ توحید کے دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کائنات کا جو نقشہ بنا ہے اس کے بعض پہلوؤں کو ہم یہاں مختصراً بیان کریں گے۔

کامل سپردگی ـــــ کائنات کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی مکمل اطاعت کر رہی ہے (فصلت ۱۲) زمین، سورج اور تمام ستارے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ وسیع خلا میں گھوم رہے ہیں۔ مگر کھرب ہا کھرب سال کے اندر بھی ان کی گردش میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں آتا۔ ہر چیز کا جو وظیفہ مقرر ہے، انتہائی صحت کے ساتھ وہ اس کی ادائگی میں مصروف ہے۔ انسان کو بھی اپنی زندگی میں اسی کامل سپردگی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے ذاتی ارادہ کو مکمل طور پر خدا کے تابع کر دے۔ وہ وہی کرے جو اس کا مالک اس سے چاہتا ہے ـــ اس کے ہاتھ اور پاؤں، اس کی آنکھ اور زبان، اس کا دل اور دماغ سب اللہ کے آگے اس طرح جھکے ہوئے ہوں کہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی فعل ان سے سرزد نہ ہو۔

عبادت الٰہی ـــــ قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کی عبادت اور تسبیح کر رہی ہے (نور ۴۱) چڑیاں جب درخت کی ہری بھری شاخوں پر بیٹھ کر چہچہاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق اور رب کی تعریف کے نغمے گا رہی ہیں۔ کھڑا ہوا درخت جب اپنا سایہ زمین پر ڈالتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سجدہ میں گر گیا ہے۔ رات کی تاریکی کے بعد صبح کو جب سورج اپنی حسین کرنیں زمین پر پھیلاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو: "پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں تمام روشنیوں کا مین سوئچ ہے۔ اگر وہ اس مین سوئچ کو بند کر دے تو ساری کائنات میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے"۔ اسی عبادت کا مطالبہ انسان سے بھی ہے۔ اس کو بھی یہی کرنا ہے کہ اپنے رب کی حمد و تسبیح کرے، اس کی خوبیوں اور کمالات کے احساس سے اس کا دل سرشار رہے، اس کی یاد اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ بن جائے، اس کی عبادت گزاری کو وہ اپنی زندگی کا مستقل مشغلہ بنا لے۔

قابل پیشین گوئی کردار ـــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اتنی صحت کے ساتھ حرکت کرتی ہے کہ مستقبل کے واقعات کا پیشگی اندازہ کیا جا سکتا ہے (یونس ۵) وہ مکمل طور پر قابل پیشین گوئی (Predictable) ہے۔ یہی چیز انسان سے بھی اس کی زندگی میں مطلوب ہے۔ انسان کو اتنا پابند اور اتنا ذمہ دار ہونا چاہئے کہ پیشگی طور پر یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ کس موقع پر اس کی طرف سے کس قسم کا رد عمل ظاہر ہوگا۔ کوئی معاملہ کرتے وقت پہلے سے یقین کیا جا سکے کہ کون سا رویہ اس کی طرف سے سامنے آئے گا۔ اس کے قول پر اسی طرح بھروسہ کیا جا سکے جس طرح اپنی گھڑیوں کو درست کرنے کے لئے ہم سورج کی رفتار پر بھروسہ کرتے ہیں۔

توافق ـــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام اجزاء، حد درجہ توافق Harmony کے ساتھ عمل کرتے ہیں (یٰس ۴۰) سورج اور چاند کبھی ایک دوسرے کے حریف نہیں بنتے۔ ستاروں اور ستاروں میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی اور دھوپ اور مٹی سب آپس میں کامل ہم آہنگ ہو کر کام کرتے ہیں۔ تقریباً ایک سو عناصر اور ان سے بنے ہوئے بے شمار مادی مجموعے اس قدر متوافق طور پر اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں کہ ان میں کبھی باہمی آویزش کا مشاہدہ نہیں کیا گیا۔ اب انسان کو بھی یہی کرنا ہے کہ وہ باہمی کشمکش سے مکمل طور پر بچتے ہوئے اپنے اپنے حصہ کا کام انجام دے۔ ہر انسان دوسرے انسان سے ٹکرائے بغیر اپنا فریضۂ حیات پورا کرے۔

نتیجہ پسندی ـــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی سرگرمیاں ہمیشہ ایک مفید انجام کی طرف جاتی ہیں (رعد ۱۷) زمین کی گردش، رات دن کا آنا جانا، بارش کا برسنا اور موسموں کا بدلنا، اور دوسری تمام سرگرمیاں نتیجہ پسند (Result Oriented) ہیں۔ سب کی سب نتیجہ خیز رخ پر سفر کرتی ہیں۔ فطرت کو آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ کبھی کسی غیر مفید انجام پر ختم نہیں ہوتی۔ یہی اصول انسان کو بھی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کو ہمیشہ نتیجہ رخی، بالفاظ دیگر مفید انجام کا حامل ہونا چاہئے۔ ہر ایسی سرگرمی سے اس کو مکمل طور پر دور رہنا چاہئے جو عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے یا کوئی ناپسندیدہ نتیجہ برآمد کرنے والی ہو۔

ارتقائی طریقہ ـــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھلانگوں میں سفر نہیں کرتی بلکہ ارتقائی انداز میں واقعات کو ظہور میں لاتی ہے (ابراہیم ۲۷) درخت اچانک طلسماتی طور پر زمین کے اوپر کھڑا نہیں ہو جاتا بلکہ طویل مدت کے اندر تدریجی طور پر وجود میں آتا ہے۔ یہی تمام چیزوں کا حال ہے۔ انسان کو بھی اسی طریقہ کی پیروی کرنی ہے۔ اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ تدریجی اور ارتقائی طور پر نتائج حاصل کرنے کا منصوبہ بنائے نہ کہ چھلانگ لگا کر منزل تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

یکسانیت ـــــ کائناتی چیزوں میں ظاہر و باطن کا کوئی فرق نہیں۔ وہ اندر اور باہر یکساں ہیں۔ سورج اپنی ذات میں جیسا ہے، ٹھیک اسی شکل میں وہ دوسروں کے سامنے بھی طلوع ہوتا ہے۔ یہی بات انسان سے قول و عمل کی یکسانی کی صورت میں مطلوب ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ جو اس کے دل میں ہے وہی وہ زبان پر لائے۔ جیسا کچھ وہ عمل میں ہے ویسا ہی لفظوں میں بھی اپنے کو ظاہر کرے۔ اس سے کسی کو منافقت یا دوعملی کا تجربہ ہرگز نہ ہو۔

خدائی اخلاقیات کا ظہور کائنات میں

حقیقت یہ ہے کہ حکمت و معنویت کا جو واقعہ وسیع تر کائنات میں خدا اپنے براہ راست کنٹرول کے تحت ظہور میں لا رہا ہے وہی واقعہ انسان کو اپنی زندگی میں ذاتی کنٹرول کے تحت وجود میں لانا ہے۔ جو واقعہ خدا نے اپنی کائنات میں مادی سطح پر قائم کر رکھا ہے وہی انسان کو اپنی زندگی میں اخلاقی اعتبار سے بروئے کار لانا ہے —— کائناتی سطح پر جو چیز حدید (لوہا) کی شکل میں پائی جاتی ہے، وہ انسانی سطح پر پختہ کرداری کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز پتھریلی زمین سے چشمہ کی صورت میں بہہ نکلتی ہے، وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز اٹل قوانین کی صورت میں پائی جاتی ہے، وہ انسانی سطح پر ایفائے عہد کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز مہک اور لذت اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر خوش معاملگی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر کھربوں ستاروں کی ایک کہکشاں مسلسل حرکت کرتی ہے۔ مگر اس کے ستاروں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ حتی کہ ایک کہکشانی جھرمٹ حرکت کرتا دوسرے کہکشانی جھرمٹ میں داخل ہوتا ہے اور نہایت تیز سفر کرتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ مگر دونوں جھرمٹوں میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ یہی واقعہ انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسانی مجموعے اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ مگر ان میں کبھی ایک دوسرے سے نزاع اور ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔ درخت خراب ہوا (کاربن) کو لے لیتا ہے اور اس کے بدلے اچھی ہوا (آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہی بات انسانی سطح پر اس اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ "جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو"۔ کائنات میں کوئی چیز کسی کی کاٹ میں لگی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک پوری یکسوئی کے ساتھ صرف اپنا اپنا حصہ ادا کرنے میں مصروف ہے۔ یہی چیز انسانی سطح پر اس شکل میں مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کرے، منفی کارروائیاں کرنے سے مکمل طور پر پرہیز کرے۔ کائنات میں دوبارہ گردش (Recycle) کا اصول کارفرما ہے۔ پتی درخت سے گر کر ضائع نہیں ہوتی بلکہ کھاد بن جاتی ہے۔ فضلات دوبارہ استعمال ہونے کے لئے گیس میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے اور اس کے بعد پھر سمندر میں واپس آجاتا ہے۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کا خرچ کیا ہوا پیسہ دوبارہ انسان کے لئے مفید بنے۔ ایک انسان کی چھیڑی ہوئی جدوجہد دوسرے انسانوں کو اچھے ثمرات کا تحفہ دے۔ میدانی علاقوں میں پانی زمین کے نیچے ملتا ہے اس لئے میدانی درخت نیچے گہرائی میں اپنی جڑیں لے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس پہاڑی ڈھلوانوں پر پانی صرف اوپری سطح پر ملتا ہے، اس لئے پہاڑی درخت اپنی جڑیں اوپر اوپر پھیلاتے ہیں۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ وہ اپنی جدوجہد میں حالات سے مطابقت (Adjustment) کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ حالات سے لڑنے کا —— کائنات ذرہ سے لے کر ستاروں تک بے حد تیز سفر میں مصروف ہے۔ وہ ہر آن ایک بہت بڑے کارخانہ کی طرح کام کر رہی ہے۔ مگر اس میں کہیں بھی شور سنائی نہیں دیتا۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ وہ خاموش جدوجہد کا طریقہ اپنائے، شور وغل کی سیاست چلانے سے مکمل پرہیز کرے۔ کائنات میں عظیم الشان سطح پر بے شمار

کام ہو رہے ہیں۔ ہر چیز انتہائی صحت اور پابندی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں لگا ہوا ہے۔ مگر کسی کو یہاں کوئی ظاہری بدلہ نہیں ملتا۔ یہی چیز انسان سے بھی مطلوب ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگا رہے، بغیر اس کے کہ اس دنیا میں اس کو اس کے عمل کا کوئی معاوضہ ملنے والا ہو۔ اونچا پہاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تواضع اختیار کرے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے، کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے ——— نماز اسی قسم کی زندگی کی ایک علامتی تصویر ہے جو روزانہ پانچ وقت خدا کے وفادار بندوں پر فرض کی گئی ہے۔

کائنات میں ہر آن جو سرگرمیاں جاری ہیں وہ خاموش زبان میں پکار رہی ہیں کہ خدا کی دنیا میں کون قیمت والا ہے اور کون بے قیمت ہے ـــ وہ لوگ جن کو صرف ظاہری مفاد متحرک کر سکتا ہو (خواہ وہ روپیہ پیسہ کا مفاد ہو یا عزت و شہرت کا مفاد) وہ اس غیر معاوضہ طلب دنیا میں بالکل بے قیمت ہیں۔۔ کائنات میں ظاہر کی ہوئی خدائی اخلاقیات کے معیار پر وہ پورے نہیں اترتے۔ خدا کی دنیا میں وہی لوگ قیمت رکھتے ہیں جو خالص صداقت کی خاطر متحرک ہوئے ہوں۔ جو تسکین ذات سے اوپر اٹھ کر عمل کا ثبوت دینے والے ہوں۔ جو ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر کام کریں۔ آئندہ آنے والے جنتی دور میں وہ تمام لوگ خدا کی دنیا سے باہر دھکیل دیئے جائیں گے جنھوں نے قریبی مفاد (عاجلہ) کے لئے سرگرمیاں دکھائی تھیں۔ اور خدا کی یہ حسین اور خوشیوں سے بھری ہوئی دنیا ہمیشہ کے لئے صرف ان لوگوں کی وراثت میں دے دی جائے گی جو دیر میں آنے والے فائدہ (آخرت) کے لئے سرگرم عمل رہے تھے۔ جو سامنے کی چیزوں سے اوپر اٹھ کر "غیب"، کی طرف اپنی توجہ لگائے ہوئے تھے :

" اور انھوں نے قدر نہ پہچانی اللہ کی جیسی کہ قدر ہے اس کی۔ حالاں کہ قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ وہ پاک ہے اور بہت اوپر ہے ان کے شرک سے۔ اور اس روز پھونک ماری جائے گی صور میں۔ پھر تمام آسمان اور زمین والے بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ صرف وہی بچے گا جس کو خدا چاہے۔ پھر دوبارہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے ہو جائیں گے اور دیکھنے لگیں گے۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور سب کے اعمال نامے سامنے رکھ دیئے جائیں گے اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور ٹھیک ٹھیک سب کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ کسی کے اوپر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ ہر شخص کو پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کیا تھا۔ اور اللہ کو خوب خبر ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اور انکار کرنے والے گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو جہنم کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے چوکیدار ان سے کہیں گے : کیا تمھارے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغام پہنچانے والے نہ آئے تھے جو تم کو خدا کی باتیں سناتے تھے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے۔ وہ جواب دیں گے ہاں۔ مگر عذاب کا وعدہ منکروں کے اوپر پورا ہو کر رہا۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ اس میں پڑے رہو۔ کیسا برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف روانہ

کئے جائیں گے۔ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور جنت کے دروازے کھولے جائیں گے تو جنت کے فرشتے کہیں گے، سلامتی ہو تم پر۔ خوش رہو۔ جنت میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔ اہل جنت کہیں گے۔ شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے اپنے وعدہ کو سچا کر دیا اور ہم کو اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں۔ کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔ اور تو دیکھے گا فرشتوں کو کہ گھیر رہے ہوں گے عرش کے گرد پاکی بولتے ہوئے اپنے رب کی خوبیوں کی۔ اور تمام بندوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور یہی بات ہوئی کہ سب خوبی اللہ کے لئے ہے جو مالک ہے سارے جہان کا" (زمر۔آخر)

کائنات میں انتہائی وسیع پیمانہ پر ہر آن یہ دکھایا جارہا ہے کہ آئندہ بننے والی معیاری دنیا (جنت) میں بسانے کے لئے خدا کو کس قسم کے شہری درکار ہیں۔ اس کو وہ انسان درکار ہیں جو کائناتی اخلاقیات کے معیار پر پورے اتریں۔ وہ اس دین کو اختیار کریں جو اس نے لفظی طور پر اپنی کتاب میں اور عملی طور پر اپنی کائنات میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ اس سے سبق نہ لیں اور خود اپنے گھڑے ہوئے راستوں پر چلتے رہیں، وہ خدا کی نظر میں بدترین مجرم ہیں۔ خدا کے بتائے ہوئے "دین" کے سوا جو دین بھی وہ اختیار کریں گے وہ آخرت میں بالکل بے قیمت ہوگا۔ کیوں کہ انھوں نے خدا کی نشانیوں کا انکار کیا (کہف ۱۰۵) جو لوگ آنکھ رکھتے ہوئے خدا کی نشانیوں کو نہ دیکھیں اور کان رکھتے ہوئے خدا کی آوازوں کو نہ سنیں، وہ خدا کے نزدیک جانور سے بھی زیادہ بدتر ہیں (انعال ۲۲)
آئندہ بننے والی دنیا میں ان کا جو انجام ہوگا اس کا اعلان خدا کی کتاب میں ان لفظوں میں کر دیا گیا ہے:

ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا ونحشرہ یوم القیامۃ اعمی۔ قال رب لم حشرتنی اعمیٰ وقد کنت بصیرا۔ قال کذلک اتتک آیٰتنا فنسیتہا وکذلک الیوم تنسیٰ۔ وکذلک نجزی من اسرف ولم یومن بآیات ربہ ولعذاب الاخرۃ اشد وابقیٰ (طہ ۱۲۴ – ۱۲۷)

اور جس نے منھ پھیرا میری نصیحت سے تو اس کے لئے (آخرت میں) تنگی کا جینا ہوگا۔ اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کرکے اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا میرے رب! تو نے مجھ کو اندھا کیوں اٹھایا۔ میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہوگا کہ اسی طرح آئی تھیں تیرے پاس ہماری نشانیاں۔ پس تو نے ان کو بھلا دیا تو اسی طرح آج تم کو بھلا دیا جائے گا۔ اس طرح ہم بدلہ دیں گے ہر اس شخص کو جو حد سے نکل گیا اور یقین نہ لایا اپنے رب کی نشانیوں پر۔ اور یقیناً آخرت کا عذاب بڑا سخت ہے۔

نوٹ: یہ مقالہ سیمینار منعقدہ تغلق آباد نئی دہلی (۸ جنوری ۱۹۷۹) میں پڑھا گیا۔ سیمینار کا عنوان تھا:
خدا کی وحدانیت کے تصورات (Concepts of the Unity of God)

اسلام دین فطرت

عن ابی عبد الرحمٰن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: بُنی الاسلام علی خمسٍ شہادۃِ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً عبدہ ورسولہ، واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وحج البیت، وصوم رمضان (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا۔ اور زکوٰۃ ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

بعض روایتوں میں یہ الفاظ ہیں کہ اسلام کی تعمیر پانچ ستونوں (خمس دعائم) پر کی گئی ہے (کتاب الصلوٰۃ محمد بن نصر المروزی) ایک عمارت اپنی تفصیلی صورت میں بہت سے اجزاء کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مگر ساری عمارت جس چیز کے اوپر کھڑی ہوتی ہے وہ چند کھمبے (Pillars) ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کے لئے بھی یہ پانچ چیزیں کھمبے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے مضبوط ہونے سے اسلام مضبوط ہوتا ہے اور ان کے کمزور ہونے سے اسلام کمزور ہوجاتا ہے۔ ہر آدمی کی ہستی ایک زمین کی مانند ہے۔ اگر وہ اپنی اس "زمین" پر خدا کی پسند والی عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ ان پانچ کھمبوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ قائم کرے۔ ان کھمبوں کو گاڑے بغیر نہ فرد کی سطح پر اسلام کا ظہور ہوسکتا ہے اور نہ سماج کی سطح پر۔

اسلام آدمی کے اندر جو زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے وہ ایک لفظ میں عبادت یا خدا پرستی کی زندگی ہے۔ تاہم اپنی تفصیلی صورت میں وہ پانچ چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے: ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ یہ پانچ چیزیں پانچ رسمیات نہیں ہیں بلکہ پانچ اوصاف ہیں۔ یہ ان مطلوب چیزوں کا خلاصہ ہے جو ہمارا مالک ہماری زندگیوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ پانچ اوصاف آدمی کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہوجائیں تو گویا اس کے اندر وہ بنیادی صلاحیت پیدا ہوگئی جس کے بعد یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس کی زندگی میں اس ربانی کردار کا ظہور ہو جس کو اسلام ایک ایک شخص کی زندگی میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایمان کا مطلب خدائی حقیقتوں پر یقین ہے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بڑائی کے آگے اس طرح جھکے کہ اپنی بڑائی کا احساس اس کے اندر سے ختم ہوجائے۔ روزہ اللہ کے بھروسے پر صبر کرنے کا نام ہے۔ زکوٰۃ یہ ہے کہ آدمی دوسرے کا حق پہچانے تاکہ خدا اس کو اس کے حصہ سے محروم نہ کرے۔ حج سے یہ مراد ہے کہ خدا کے بندے خدا کے گرد متحد ہوجائیں۔ یہ سب اپنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے اوصاف ہیں نہ کہ محض خارجی مراسم۔ گویا کہ یقین، بے نفسی، صبر، حق شناسی اور اتحاد وہ پانچ صفاتی کھمبے ہیں جن کے اوپر اسلامی زندگی کا گھر بنتا ہے۔

۱۔ اللہ کو اپنا الٰہ بنانے کا اقرار اس کو اپنا سب کچھ بنانے کا معاہدہ ہے۔ یہ اللہ کو اپنے احساسات اور

جذبات کا مرکز بناتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے کرنا ہے۔ یہ اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ آدمی اپنی امیدوں اور تمناؤں، اپنے اندیشوں اور التجاؤں کا مرکز اللہ کو بنائے گا۔ وہ کہیں اور جینے کے بجائے اپنے رب میں جئے گا۔ آدمی کی امیدیں اور اس کے احساسات جہاں اٹکے ہوئے ہوں، وہیں وہ آدمی جی رہا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہر آدمی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کہیں نہ کہیں جی رہا ہوتا ہے۔ کوئی اپنے گھر بار اور اپنے بال بچوں میں جیتا ہے۔ کوئی اپنے معاش اور کاروبار میں جیتا ہے۔ کوئی اپنے سیاسی مشاغل اور قیادتی مصروفیات میں جیتا ہے، کوئی اپنی عزت اور اقتدار کے خوابوں میں جیتا ہے۔ غرض ہر آدمی کہیں نہ کہیں جی رہا ہے۔ مگر یہ تمام جینا جاہلیت کا جینا ہے۔ یہ اپنا آشیانہ ایسی شاخوں پر بنانا ہے جن کا حقیقۃً کوئی وجود نہیں۔ حقیقی جینا یہ ہے کہ آدمی اپنے رب میں جینے لگے۔ وہ اس سہارے کو پکڑ لے جس کے سوا اس کائنات میں کسی کے لئے کوئی سہارا نہیں۔ وہ اللہ کی یاد کو لے کر سوئے اور اللہ کی یاد کے ساتھ صبح کرے۔ وہ اسی کے بھروسہ پر رُکے اور اسی کے بھروسہ پر چلے۔ وہ اسی کے لئے بولے اور اسی کے لئے خاموشی اختیار کرے۔

ایمان کی مثال بجلی کی کرنٹ کی سی ہے۔ پاور ہاؤس سے بجلی کی کرنٹ جب کارخانہ میں پہنچتی ہے تو سارا کارخانہ جگمگا اٹھتا ہے۔ اس کی تمام کلیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ اسی طرح جب کسی بندے کا اپنے رب سے ایمانی تعلق قائم ہوتا ہے تو اس کے اندر اچانک ایک نئی روشنی آجاتی ہے، اس کی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ ایمان اس کے قلب کو گرمانے والا اور اس کی روح کو تڑپانے والا بن جاتا ہے۔ وہ اس کے اندر ایک نئی آگ لگا دیتا ہے۔ وہ انسان جو پہلی بار اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، وہ دوبارہ ایمان کے کوکھ سے ایک نیا جنم لیتا ہے۔ وہ اب خدا سے الگ نہیں رہتا بلکہ خدا میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کو کسی سے محبت ہو تو جسمانی طور پر وہ اس سے جدا رہتے ہوئے بھی حسیاتی طور پر وہ اس سے مل جاتا ہے۔ وہ ہر چیز میں اسی کا جلوہ دیکھنے لگتا ہے۔ یہی حال اللہ پر ایمان لانے والے کا ہوتا ہے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں خدا کی عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ طوفانوں کی قہرمانی میں اس کو خدا کا جلال دکھائی دیتا ہے۔ چڑیوں کے چہچہے میں اس کو خدا کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ سورج نکلتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے اپنا نورانی ہاتھ اس کی طرف بڑھایا ہے۔ وہ درختوں کو دیکھتا ہے تو اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خدا کی تخلیقی کہانی سرسبز صفحات کی صورت میں زمین کے اوپر پھیلا دی گئی ہے۔ ہوا کا جھونکا جب اس کو چھوتا ہے تو وہ اس کے لئے خدا سے اتصال کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ غرض جو شخص خدا کا مومن بن جائے وہ ہر آن خدا کے اتھاہ سمندر میں غوطہ لگاتا رہتا ہے۔ ہر تجربہ جو اس کے ساتھ گزرتا ہے وہ اس کو خدا سے ملانے والا بن جاتا ہے۔ وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور خدا اس کا۔

اللہ پر ایمان ایک ایسے خدا پر ایمان ہے جو ساری کائنات کا خالق، مالک اور پروردگار ہے۔ اسی نے سب کچھ بنایا ہے، اسی کے سہارے ہر چیز قائم ہے، اس کے بغیر کسی چیز کا کوئی وجود نہیں۔ ایمان آدمی کے اندر اس شعور کو زندہ کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس حیثیت سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ ایک خدا کا بندہ ہے، ہر چیز میں

اس کو خدا کا کرشمہ نظر آتا ہے اور ہر عطیہ اس کو خدا کے ہاتھ سے ملی ہوئی چیز دکھائی دیتا ہے۔ خدا کا ذکر اور اس کی حمد ہر آن اس کے اندر سے ابلتی رہتی ہے۔ ایسے آدمی کے لمحات غفلت کے لمحات نہیں ہوتے بلکہ ہوش مندی کے لمحات ہوتے ہیں۔ ہر موقع اس کے لئے خدا کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ دن بھر کا تھکا ہوا شام کو وہ اپنے بستر پر لیٹتا ہے اس کو گہری نیند آجاتی ہے۔ صبح کو وہ تازہ دم ہوکر اٹھتا ہے تو بے حساب احسان مندی کے جذبہ کے تحت اس کی زبان سے نکلتا ہے: خدایا تیرا یہ احسان بھی کیسا عجیب ہے۔ اگر آدمی پر نیند نہ آئے تو وہ پاگل ہوجائے اور چند دن کی زندگی بھی اس کے لئے محال ہوجائے۔ رات کی تاریکی کے بعد جب سورج نکلتا ہے اور دنیا کو روشن کر دیتا ہے تو اس کا دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے: کیسی بابرکت ہے، وہ ذات جس نے روشنی پیدا کی۔ اگر روشنی نہ ہو تو سارا عالم تاریکی کا مہیب سمندر بن جائے۔ جب اس کو بھوک لگتی ہے، وہ پانی پیتا ہے اور کھانا کھاتا ہے تو اس کی پوری ہستی شکر کی کیفیت سے بھر جاتی ہے۔ وہ حیران ہوکر سوچنے لگتا ہے کہ خدا اگر آدمی کے لئے کھانا اور پانی نہ اتارتا تو آدمی کا کیا حال ہوتا۔ اس کو چوٹ لگتی ہے تو وہ خدا کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ اس کو حاجتیں پیش آتی ہیں تو وہ خدا ہی سے امید کرتا ہے کہ وہ اس کی حاجتوں کو پورا فرمائے گا۔ اس کو نفع ملتا ہے تو اس کو انسان کے اوپر خدا کی نوازشیں یاد آتی ہیں۔ اور اس کا دل شکر کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اس کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کو وہ خدا کی قدرت کا ایک کرشمہ سمجھتا ہے۔ نعمتوں کا ملنا اس کو مغرور نہیں بناتا اور نقصان اس کے اندر بے صبری پیدا نہیں کرتا۔ کوئی عقیدت اس کے لئے خدا کی حریف نہیں بنتی۔ کوئی مصلحت اس کو خدا سے بے پروا نہیں کرتی۔

ایک شخص زمین اور دوسرے اجرام کی قوت کشش کو دریافت کرے یا کائناتی شعاعوں کو اپنے آلات کی مدد سے پالے تو یہ اس کے لئے محض ایک علمی یافت ہوگی۔ یہ پانے والے سے کسی ذمہ داری کا تقاضا نہیں کرے گی۔ مگر خدا کو پانے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خدا کو پانا ایک ایسی ہستی کو پانا ہے جو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو حکمت اور طاقت کا خزانہ ہے۔ ایسے خدا کو جب ایک شخص پاتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ اس حقیقت کو بھی پالیتا ہے کہ خدا نے اس کو اور اس کائنات کو عبث نہیں بنایا ہے۔ ایک عظیم الشان کائنات یوں ہی خاموش کھڑی رہے اور اس کی معنویت کبھی ظاہر نہ ہو، یہ ایک ایسی کائنات میں بالکل ناممکن ہے جس کا بنانے اور چلانے والا ایک علیم اور عزیز خدا ہو۔ اس طرح اس کی ایمانی یافت اس کو اس یقین تک پہنچاتی ہے کہ ضرور ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب کہ وہ خدا لوگوں کے سامنے ظاہر ہوجائے جو کائنات کے تمام واقعات کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ جب آدمی ان حقائق کو دیکھ کر جان لے جن کی بابت آج وہ نظر نہ آنے کی وجہ سے جھگڑ رہا ہے۔ پھر یہی یقین اس کو یہ بھی بتاتا ہے کہ کائنات کے خالق و مالک کا ظہور اس قسم کا غیر متعلق ظہور نہیں ہوگا جیسے تاریک رات کے بعد روشن سورج نکلتا ہے۔ یہ ایک باشعور اور محاسب و مجازی طاقت کا ظہور ہوگا۔ خداوند کائنات کا ظہور کائنات کے لئے قیامت کے ہم معنی بن جائے گا۔ خدا کے ظاہر ہوتے ہی اس کے تمام سرکش اور خود پرست بندے خدا کی اس دنیا میں بے قیمت ہوجائیں گے۔ وہ اس دن مکھی مچھر سے بھی زیادہ حقیر نظر آئیں گے۔ دوسری طرف اس کے خدا پرست اور وفادار بندے اچانک سرفرازی کا مقام

حاصل کرلیں گے۔ خدا کا غیب میں ہونا خدا کے غیر وفادار بندوں کو اچھل کود کے مواقع دئے ہوئے ہے۔ خدا کا ظاہر ہونا خدا کے وفادار بندوں کے لئے سرفرازی کا دن بن جائے گا۔ اس کے بعد، ایک نئی، زیادہ بہتر اور مکمل دنیا شروع ہوگی جہاں سرکش لوگ ابدی طور پر جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے اور وفادار لوگ ابدی طور پر جنت میں خوشیوں اور لذتوں کی زندگی گزاریں گے۔

جب آدمی اس یقین تک پہنچتا ہے تو وہ خدا کی ہیبت سے کانپ اٹھتا ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے: "خدایا مجھے اس دن رسوا ہونے سے بچا جب تو اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ جب انصاف کا ترازو قائم کیا جائے گا۔ جب آدمی بالکل بے بس حالت میں تیرے سامنے کھڑا ہوگا۔ جب تیرے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہ ہوگا۔"

خدا کو اللہ بنانے ہی کا ایک پہلو رسول کی رسالت کو ماننا ہے۔ جب آدمی خدا کو ایک زندہ اور باشعور ہستی کی حیثیت سے پاتا ہے تو فوراً یہ سوال اس کے سامنے آجاتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کو اندرونی فطرت سے اشارے ملتے ہیں۔ کائنات اپنی خاموش زبان میں کچھ پیغامات نشر کرتی ہوئی نظر آتی ہے مگر وہ چاہتا ہے کہ اپنے رب کے پیغام کو یقینی زبان میں پالے، وہ آنے والے دن سے پہلے اس دن کے معاملات سے باخبر ہو جائے۔ عین اس وقت اس کو پیغمبر کی آواز سنائی دیتی ہے: "میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، اللہ نے مجھ کو انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ میری طرف آؤ اور مجھ سے اپنے رب کے پیغامات معلوم کرو۔" جو انسان حقیقتاً طالب ہو، جو فی الواقع سچائی کی تلاش میں ہو، اس کے لئے اس آواز کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ تعصب اور غفلت کے ان تمام پردوں کو پہلے ہی پھاڑ چکا ہوتا ہے جو آدمی کو گھیرے رہتے ہیں اور سچائی کی آواز کو اس کے اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔ ایک بچہ جس طرح اپنی ماں کی آواز کو پہچان لیتا ہے، اسی طرح وہ اس پیغام کو پہچان لیتا ہے جو پیغمبر کی معرفت اس کے رب کی طرف سے اس کو پہنچ رہی ہے۔ پیغمبر کی آواز اس کے لئے ایسی ہی ثابت ہوتی ہے جیسے پٹرول کی آگ یا سوکھی زمین میں بارش۔ اس کا پورا اندرونی وجود ربانی روشنی سے بھڑک اٹھتا ہے۔ اس کی تلاش کی سوکھی زمین حق کی بارش کے ایک ایک قطرہ کو جذب کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ خدا کو پانے کے ساتھ اس کے پیغمبر کو پالیتا ہے اور پیغمبر کو پانے کے ساتھ اپنے خدا کو۔

رسول کوئی فرشتہ یا کوئی غیر انسانی وجود نہیں۔ وہ بھی ایک انسان ہے اور سارے انسانوں کی طرح ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ خدا نے اس کو اپنی پیغام رسانی کے لئے چن لیا۔ خدا نے دیکھا کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جس کی فطرت پوری طرح زندہ ہے۔ جس کے قول و عمل میں تضاد نہیں۔ جس نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی عمر تک کبھی ایک بار بھی امانت کی ادائگی میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ سچا ہے، وعدہ پورا کرنے والا ہے، وہ اپنے سینہ میں انسانیت کا درد رکھتا ہے، وہ حق کے لئے اس سے زیادہ بے چین ہوتا ہے جتنا کوئی شخص اپنے ذاتی منافع کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ خدا نے محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں وہ خالص روح پائی جو حق کی امانت کا امین بن سکے۔ اس نے اس کے اندر وہ غیر مصلحت پرستانہ کردار پایا جو کسی ادنیٰ لچک کے بغیر ربانی ذمہ داری

کو ادا کر سکے۔ اس نے اس عربی انسان میں وہ طلب دیکھی جو اس بات کی ضمانت تھی کہ وہ خدا کی الہامی امانت کی پوری قدر دانی کرے گا اور اس کو اسی طرح لے گا جس طرح اس کو لینا چاہئے۔ ان پہلوؤں میں یہ عربی انسان چالیس برس کی زندگی تک انتہائی مکمل ثابت ہوا۔ اس لئے خدا نے اس کو اپنے آخری اور عالمی پیغمبر کی حیثیت سے چن لیا اور اس انسان کامل نے اپنی نبوت کی ۲۳ سال کی زندگی سے ثابت کر دیا کہ خدا کا یہ انتخاب انتہائی درست تھا۔ اس انسان کامل نے پیغمبری کی ذمہ داری کو اتنی معیاری صورت میں انجام دیا کہ اس سے زیادہ معیاری صورت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

پیغمبر کے ذریعہ ہم کو خدا کی وہ محفوظ کتاب ملی ہے جو اس کے اوپر فرشتہ کے ذریعہ آتاری گئی۔ اس کتاب میں وہ تمام چیزیں لکھی ہوئی صورت میں موجود ہیں جو اللہ کو ہم سے مطلوب ہیں۔ قرآن میں اللہ ہم سے انسانی زبان میں ہم کلام ہوتا ہے۔ پیغمبر نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہر قسم کا بہترین اہتمام کر کے اس کو اس کی اصلی شکل میں محفوظ رکھا اور ہم کو پوری طرح پہنچا دیا۔ پیغمبر نہ صرف خدائی الہام کو وصول کرنے والا تھا بلکہ اس نے کامل اور مکمل صورت میں اس کو اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ اس طرح پیغمبر کی زندگی اس ربانی ہدایت کا عملی نمونہ بن گئی جو قرآن میں لفظوں کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔ پیغمبر نے گھریلو زندگی بنائی۔ وہ بستی اور بازار میں لوگوں کے درمیان رہا۔ اس نے دوستوں اور دشمنوں سے معاملہ کیا۔ اس کو فتح و شکست کے مواقع پیش آئے۔ اس نے دعوت دی اور دعوتی مراحل سے گزرا۔ اس کو بھوک لگی اور اس نے چوٹ کھائی۔ اس نے مفلسی اور دولت مندی کے دن دیکھے۔ غرض ایک عام آدمی سے لے کر ایک جج اور بادشاہ تک انسانی زندگی کے جتنے مختلف تجربات ہیں، سب اس پر گزرے۔ ہر جگہ اس نے ایک ربانی انسان کا رویہ اختیار کیا۔ اس طرح اس کی زندگی قیامت تک تمام انسانوں کے لئے مکمل نمونہ بن گئی۔ ہر وہ آدمی جو اپنے رب کے یہاں اس حال میں پہنچنا چاہتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو اور اس کو ابدی باغوں والے گھر میں داخل کرے، اس کے لئے ایک ہی راہ ہے۔ وہ قرآن سے اللہ کا حکم معلوم کرے اور پیغمبر کی زندگی میں اس حکم کا عملی نمونہ دیکھے اور ان دونوں چیزوں کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے لگے۔ اس کے سوا جتنی صورتیں ہیں سب بھٹکنے کی صورتیں ہیں، نجات کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ پیغمبر کی زندگی ایک ایسی مکمل زندگی ہے جس میں چھوٹے لوگوں کے لئے بھی نمونہ ہے اور بڑے لوگوں کے لئے بھی۔

۲۔ اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے۔ نماز اپنی متعین شکل کے اعتبار سے یہ ہے کہ روزانہ دن رات کے درمیان پانچ وقت مقررہ انداز میں اللہ کی عبادت کی جائے۔ یہ انداز جو رسول کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھایا ہے، اتنا جامع ہے کہ اس سے زیادہ بہتر عبادتی انداز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جب وقت آتا ہے تو اذان کے ذریعہ اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ اپنی فلاح کے لئے جمع ہو جاؤ۔ لوگ وضو کر کے اپنے پاکی کے احساس کو تازہ کرتے ہیں۔ پھر اللہ کو یاد کرتے ہوئے مسجد پہنچتے ہیں۔ وہاں سب مل کر نماز ادا کرتے ہیں۔ نماز کا ایک امام ہوتا ہے جس کی رہنمائی میں اجتماعی نماز ادا کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے

کہ اسی طرح سارے مسلمان خدا کے رسول کو اپنا مرکز اجتماع قرار دے کر اس کے گرد متحدہ زندگی گزاریں گے۔
رکوع و سجود اور قیام و قعود کی مختلف حالتوں کے ذریعہ خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کیا جاتا ہے۔ کبھی دست بستہ کھڑے ہو کر، کبھی جھک کر، کبھی نیازمندانہ بیٹھ کر، کبھی اپنے سر کو زمین پر رکھ کر خدا کے ساتھ اپنے عہد بندگی کو تازہ کرتے ہیں۔ نماز میں قرآن کے حصے پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس کو جہاں کہیں سے اور جتنا بھی پڑھئے، قرآن کی دعوت کا تعارف مل جاتا ہے۔ قرآن کا ہر صفحہ گویا قرآن کا خلاصہ ہے۔ اس طرح نماز میں اگرچہ بیک وقت قرآن کا مختصر حصہ پڑھا جاتا ہے مگر وہ اللہ کی پسند و ناپسند کو جاننے کے لئے ہمیشہ کافی ہوتا ہے۔
اسی کے ساتھ نماز میں خدا کی حمد اور ذکر کے کلمات بولے جاتے ہیں، اس سے دعا کی جاتی ہے، رسول کے لئے اور تمام اہل ایمان کے لئے نیک جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا خاتمہ تمام انسانوں کو سلامتی بھیج کر کیا جاتا ہے۔ اس طرح اپنے مختلف اجزاء کے ذریعہ نماز ایک ایسا عمل بن جاتی ہے جو بیک وقت اللہ کی عبادت بھی ہے اور اللہ کے حکموں کی یاد دہانی بھی۔ وہ اہل ایمان کے لئے دینی غذا بھی ہے اور ان کے درمیان اتحاد و اجتماعیت کا ذریعہ بھی۔ وہ اسلامی زندگی کا نشان بھی ہے اور نظم و ضبط کی تربیت بھی۔ وہ اللہ سے روحانی اتصال کا مقام بھی ہے اور روزمرہ کی زندگی میں حرکت و عمل کا سبق بھی۔

نماز اپنی شکل کے اعتبار سے مخصوص عبادت کا نام ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے تواضع اور توجہ الی اللہ کا۔ اپنے مقابلہ میں کسی کی عظمت تسلیم کرنے کے لئے آدمی زبان سے جو آخری کلمہ بول سکتا ہے وہ یہ کہ وہ کہے "وہ سب سے بڑا ہے"۔ نماز میں بار بار یہ کلمہ (اللہ اکبر) خدا کے لئے بولا جاتا ہے اور اس طرح اپنے مقابلہ میں خدا کی مطلق کبریائی کا لسانی اقرار کیا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر کسی کی بڑائی کے اعتراف کی آخری صورت سجدہ ہے۔ سجدہ سے بڑھ کر کوئی صورت نہیں ہو سکتی جس سے آدمی دوسرے کی عظمت کا جسمانی اعتراف کرے۔ نماز میں بار بار خدا کے آگے سجدہ کرکے خدا کی بے مثال عظمتوں کا عملی اعتراف کیا جاتا ہے۔ کسی کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنانے کی سب سے زیادہ کامیاب ہیئت جو تصور کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے چہرے کا رخ پوری طرح اس کی طرف کر دے۔ نماز میں بیت اللہ کی طرف رخ کا اہتمام کرکے ظاہر کیا جاتا ہے کہ بندے نے اپنی زندگی کو خدا کی طرف موڑ دیا، اس نے اپنی زندگی کو اندر سے لے کر باہر تک خدارخی (God-Oriented) بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

اللہ کے آگے بندے کے اس جھکاؤ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ صرف خدا کے سامنے جھکاؤ تک نہیں رہتی، وہ اس کی مستقل کیفیت بن جاتی ہے۔ جو آدمی اللہ سے ڈرنے لگے، جو اللہ کے آگے جھک جائے۔ جو اللہ کے مقابلہ میں اپنے کو بے حقیقت بنالے وہ بندوں کے سامنے آئے گا تو ناممکن ہے کہ یہاں اس کے رویہ میں اس کے عبادتی اثرات ظاہر نہ ہوں۔ وہ انسان کے آگے سجدہ میں نہیں گرے گا مگر وہ انسان کے مقابلہ میں گھمنڈ بھی نہیں دکھائے گا۔ وہ انسان کو "تو بڑا ہے"، نہیں کہے گا مگر اپنی بڑائی کا سکہ اس پر قائم کرنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ نماز میں اس کا ساجد بننا بندوں کے مقابلہ میں تواضع کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ نماز میں اس کا خدا کی تابعداری کا اقرار کرنا

بندوں کے معاملات میں حقوق کی ادائگی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ نمازیں اس کی رخ بندی بندوں کے معاملات میں اصولی پابندی کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ وہ انسان جو خدا کے سامنے کامل بندگی کا اقرار کرکے مسجد سے نکلا تھا، وہ بندوں کے درمیان کامل اخلاق کا نمونہ بنا ہوا دکھائی دے گا۔ نماز کسی بندہ کے معاملات کو خدا کے ساتھ عجز کی بنیاد پر قائم کرتی ہے اور بندوں کے ساتھ اس کے معاملات کو تواضع کی بنیاد پر۔

روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ نماز کی اور بھی کئی صورتیں ہیں۔ رات کو تہجد کی نماز، کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کے وقت کی نماز، حاجت اور استخارہ کی نماز، اسی طرح جمعہ اور عیدین کی جماعت، جنازہ کی نماز جماعت، وغیرہ۔ یہ نمازیں اسی کیفیت کو مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کرنے کی کوششیں ہیں جو پنج وقتہ نمازوں سے ہر روز مطلوب ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز اگر پوری طرح کسی کو مل جائے تو وہ اس کی پوری زندگی میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک نیا کام شروع کرے تو دو رکعت نماز پڑھ کر خدا سے مدد کی درخواست کرتا ہے، وہ کسی مقام پر پہلی بار جائے تو وہاں وہ نماز پڑھ کر اپنے رب کی یاد کرتا ہے۔ کوئی مسئلہ اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو تو نماز پڑھ کر اپنے دل کی گرہ کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال بندوں سے تعلقات کے معاملہ میں بھی ہوتا ہے۔ بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا نماز اس کے ساتھ ایک خدائی نگراں کی طرح لگی ہوئی ہے۔ دنیا کی پھیلی ہوئی زندگی میں اپنا حصہ ادا کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری زمین خدا کی مسجد ہے اور ہر جگہ اس کو اپنی عبادت گزاری کے تقاضے پورے کرنے ہیں

۳۔ اسلام کا تیسرا رکن روزہ ہے۔ روزہ میں آدمی صبح کو فجر سے لے کر شام کو سورج ڈوبنے تک نہ کوئی کھانے کی چیز کھاتا اور نہ پینے کی چیز پیتا۔ اس طرح اپنی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت کو چھوڑ کر وہ صبر (رکنے اور برداشت کرنے) کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ کھانا پینا چھوڑنے کی وجہ سے اس کو دن میں بھوک لگتی ہے۔ پیاس ستاتی ہے، اس کا جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے معمولات درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ اس کی پوری زندگی کا نظام تلپٹ ہو جاتا ہے۔ مگر وہ ان تمام چیزوں کو برداشت کرتا ہے۔ وہ ناخوش گواریوں کو جھیلتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی تکلیفوں پر قابو رکھتے ہوئے اپنے ہوش و حواس کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ مشکلات کے باوجود اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پانی ہوتا ہے مگر پیاس کے باوجود وہ اس کو نہیں پیتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کھانا ہوتا ہے مگر بھوک کے باوجود وہ اس کو نہیں کھاتا، اس طرح وہ اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرتا ہے کہ وہ ایک پابند اور ذمہ دار زندگی گزارے۔ وہ وہی کرے جو اس کو کرنا چاہئے۔ اور وہ نہ کرے جو اس کو نہیں کرنا چاہئے۔ خواہ کسی بھی قسم کی مشکل پیش آئے، ہر حال میں اصل مقصد حیات کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھے۔

خدا نے دنیا کی زندگی میں بے حساب نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں۔ مگر یہ نعمتیں خود بخود ملتی رہتی ہیں اس لئے آدمی کو ان کا احساس نہیں ہوتا۔ آدمی کو ایک بے حساب قسم کا پیچیدہ جسمانی نظام دیا گیا ہے۔ ایک رگ میں

فرق آجائے تو سارے جسم کا توازن بگڑ جائے۔ دنیا میں دھوپ، ہوا، پانی اور لاتعداد دوسری چیزیں حیرت انگیز طور پر اس کے لئے کارآمد بنا دی گئی ہیں۔ اگر ایک چیز بھی ان میں سے نہ رہے تو زندگی عذاب بن جائے۔ یہ تمام چیزیں بغیر کسی اکتسابی کوشش کے آدمی کو ملتی رہتی ہیں اس لئے آدمی ان کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتا۔ روزہ میں انسان کو اس کی انتہائی بنیادی ضرورت سے عارضی طور پر کچھ دیر کے لئے روکا جاتا ہے۔ اور اس طرح اس کے اندر خدائی نعمتوں کا شعور جگایا جاتا ہے۔ دن بھر کی بھوک، پیاس، تھکن اور بے آرامی کے بعد شام کو جب آدمی کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو اس کو اپنی محتاجی اور خدا کی بے پناہ بخششوں کا احساس ہوتا ہے، وہ اللہ کے شکر کے جذبہ سے بھر جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جس خدا نے ایسی نعمتیں دی ہیں، اس کے لئے اگر میں اپنی پوری زندگی بھی قربان کر دوں تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں مومن کو جو زندگی گزارنی ہے وہ سرتاپا صبر کی زندگی ہے۔ اس کو اللہ کی جائز کی ہوئی چیزوں تک اپنے کو محدود رکھنا ہے، اس کی ناجائز کی ہوئی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگانا ہے۔ حق پرستانہ زندگی کی راہ میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی تکلیفوں کا جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا ہے بلکہ ان کو سہتے ہوئے اپنے فریضۂ حیات کو پورا کرنے میں لگے رہنا ہے۔ اس کو دنیا کے نقصانات کی پروا نہ کرتے ہوئے آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھنا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر جب کہ اس کے نفس کو چوٹ لگے، جب اس کے اندر کوئی ناپسندیدہ بات پیش آنے کی وجہ سے اشتعال پیدا ہو، تو اس کو منفی ردعمل سے اپنے آپ کو بچانا ہے اور ہر حال میں اپنے آپ کو مثبت مقاصد کے لئے وقف رکھنا ہے۔ یہ تمام چیزیں بے پناہ صبر و برداشت چاہتی ہیں۔ صبر کے بغیر کوئی شخص اسلام کے راستہ کا مسافر نہیں بن سکتا۔ روزہ ہر سال اسی صبر کا سبق دیتا ہے۔ وہ ایک مہینہ تک صابرانہ زندگی کی مشق کرا کر آدمی کو تیار کرتا ہے کہ وہ سال کے بقیہ مہینوں کو صبر کے ساتھ گزار سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کی پوری زندگی ایک قسم کی روزہ دار زندگی ہے۔ اس کو تمام عمر برائی سے، منفی تدبیروں سے، بے صبری کے اقدامات سے، دوسروں کو ستانے سے، اللہ کے حرام کو حلال کرنے سے روزہ رکھ لینا ہے۔ سال کے ایک مہینہ میں ضروریات زندگی پر پابندی لگا کر اسی قسم کی "روزہ دار" زندگی کی مشق کرائی جاتی ہے۔ روزہ اپنی شکل کے اعتبار سے مقررہ اوقات کے لئے کھانا پانی چھوڑنا ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے صابرانہ زندگی کی تربیت۔

۴۔ اسلام کا چوتھا رکن زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کمائی اور اپنی دولت سے ہر سال ایک مقررہ رقم (عام طور پر ڈھائی فی صد) اللہ کے نام پر نکالی جائے۔ اور اس کو دین کی ضرورتوں اور حاجت مندوں کے اوپر خرچ کیا جائے۔ یہ زکوٰۃ ایک قسم کی سالانہ یاددہانی ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنی کسی چیز کو خدا سے بچا کر نہ رکھے۔ دنیا میں آدمی جو کچھ حاصل کرتا ہے، اس کا اپنا حصہ اس میں بہت تھوڑا ہوتا ہے زمین و آسمان کے اندر جو بے شمار اعلیٰ ترین انتظامات ہیں اگر وہ ساتھ نہ دیں تو آدمی نہ کوئی دانہ اگا سکے، نہ مویشیوں کی پرورش کر سکے۔ نہ صنعتیں قائم ہو سکیں، نہ اور کوئی کام کرنا ممکن ہو۔ انسان کے اپنے وجود سے

لے کر باہر کے عالم تک جو خدائی انتظامات ہیں، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر خدا واپس لے لے تو آدمی کی ساری کوششیں اور منصوبے اکارت چلے جائیں اور کوئی نتیجہ پیدا نہ کریں۔

زکوٰۃ اسی حقیقت واقعہ کا مالی اعتراف ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی اپنے مال کو خدا کا مال سمجھے۔ اپنی کمائی میں خدا کا حق تسلیم کرے۔ اس معاملہ میں زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ تاہم کم سے کم کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ قانونی زکوٰۃ کی صورت میں آدمی ہر سال کم سے کم خدا کا حق نکالتا ہے اور اس کو جمع کر کے خدا کی مقرر کی ہوئی مدوں میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اس نکالنے میں آدمی کو نہ تو یہ اجازت ہے کہ وہ اس کو دوسروں کے اوپر احسان سمجھے اور نہ اس کو ایسا کرنا چاہئے کہ پانے والوں کو ذلیل کرے۔ اس کو اس جذبہ کے تحت دینا چاہئے کہ یہ خدا کی طرف سے آیا ہوا دوسروں کا حصہ ہے اور وہ اس کو حق داروں کی طرف لوٹا رہا ہے۔ وہ اس لئے دوسروں کو کھلائے تاکہ خدا آخرت کے دن اس کو کھلائے، وہ اس لئے دے تاکہ خدا آخرت کے دن اس کو محروم نہ کرے۔

زکوٰۃ ان ذمہ داریوں کی ایک علامت ہے جو ایک آدمی کو دوسرے انسانوں کے درمیان ادا کرنا ہے۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کا حق پہچانے، ہر آدمی دوسرے آدمی کے لئے درد مند ہو۔ یہ جذبات یہاں تک ترقی کریں کہ آدمی خود اپنی چیزوں تک میں دوسرے کا حصہ سمجھنے لگے۔ دوسرے سے کوئی معاوضہ نہ ملتے ہوئے بھی وہ اس کے کام آئے۔ دوسرے سے نفع کی امید نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی عزت کا نگہبان ہو — دوسرے سے رشتہ اور دوستی کا تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ زکوٰۃ ایک طرف آدمی کو یہ سبق دیتی ہے کہ اس کی ہر چیز خدا کا عطیہ ہے۔ دوسری طرف اس کو یہ احساس دلاتی ہے کہ تم اگر خدا کے بندے ہو تو تم کو معاشرہ کے اندر بے درد اور خود غرض بن کر نہیں رہنا چاہئے۔ بلکہ تمھاری زندگی میں دوسروں کا بھی حصہ ہونا چاہئے۔

سماجی تنظیم کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے کام صرف اس وقت آئے جب کہ اس کو دوسرے سے نفع کی امید ہو۔ وہ کسی کو قرض دے تو اس اعتماد پر دے کہ وہ سود کے ساتھ اس کی طرف اضافہ شدہ حالت میں لوٹے گا۔ ایسے معاشرہ میں استحصال کا مزاج فروغ پاتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے آدمی کو دبانا اور لوٹنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا سماج بدنظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے سماج میں کسی کو بھی سکون حاصل نہیں رہتا۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ سماجی تنظیم کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی خدا سے بدلہ پانے کی امید پر دوسرے انسان کے کام آئے۔ وہ اس خدائی یقین دہانی کی بنیاد پر دوسرے کو دے کہ خدا اس کو آخرت میں بہت زیادہ بڑھا کر لوٹائے گا۔ ایسے معاشرہ میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور بے تعلقی کے جذبات فروغ نہیں پاتے۔ لوگ ایک دوسرے کو استحصال کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ سماج میں باہمی ناراضی اور انتشار کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔ ہر ایک دوسرے کی طرف سے امن میں رہتا ہے اور پورا سماج سکون اور خوش حالی کا سماج بن جاتا ہے۔ زکوٰۃ قانونی اعتبار سے ایک قسم کا سالانہ "ٹیکس" ہے اور حقیقت کے اعتبار سے اپنی ملکیت میں خدا اور بندے کے حق کا اعتراف۔

۵۔ اسلام کا پانچواں رکن حج ہے۔ سال میں ایک بار ساری دنیا کے مسلمان مرکز اسلام میں جمع ہوتے ہیں

اور وہاں مخصوص اجتماعی عبادات انجام دیتے ہیں۔ حج کی عبادات کیا ہیں — یہ دراصل ان اسلامی تعلیمات کو علامتی طور پر دہراتا ہے جو اسلام میں معنوی طور پر مطلوب ہیں۔ یہ اسلام کے احکام کو مخصوص صورتوں میں متشکل کر کے اللہ سے یہ عملی عہد کرنا ہے کہ آدمی انھیں بنیادوں پر اپنی زندگی کو قائم کرے گا۔ اسلام کی دوسری عبادات میں بھی اگرچہ یہ پہلو موجود ہے۔ تاہم حج میں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور مجموعی شکل میں یہ تمام چیزیں اکٹھا کر دی گئی ہیں۔

اسلام چاہتا ہے کہ انسانوں کے درمیان ہر قسم کے مصنوعی امتیازات ختم ہو جائیں اور تمام انسان ایک خدا کے بندے بن کر دنیا میں زندگی گزاریں، احرام باندھنا اسی کی ایک عملی صورت ہے جس میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے لوگ یکساں طور پر ایک ہی سادہ لباس پہنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسلام چاہتاہے کہ آدمی کی زندگی خدا کے گرد گھومنے لگے، کعبہ کے گرد طواف کرنا اسی کا ایک علامتی مظاہرہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ خدا کے بندے خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے بنیں، صفا و مروہ کے درمیان دوڑ (سعی) اسی کی ایک مشق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ جب خدا کی پکار بلند ہو تو اس کے بندے اس کی پکار پر دوڑ پڑیں، حج کے دوران بار بار لبیک اللھم لبیک (حاضر ہوں خدایا میں حاضر ہوں) کہنا اسی کا ایک عملی اقرار ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ آدمی اس دن کو یاد کرے جب کہ سارے انسان خدا کے یہاں جمع کئے جائیں گے، عرفات کے وسیع کھلے ہوئے میدان میں تمام حاجیوں کا قیام اسی کی ایک ظاہری یاد دہانی ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی شیطان سے بیزار ہو اور ہمیشہ اس کو اپنے سے دور بھگاتا رہے، رمی جمار کے موقع پر شیطان کی پتھر کی علامتوں پر کنکریاں مارنا اسی کا ایک عملی سبق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان ہر حال میں خدا کے عہد پر قائم رہے خواہ ایسا کرنا اس کے لئے جان و مال کی قربانی کی قیمت پر کیوں نہ ہو، منیٰ میں جانور کو قربان کرنا اسی کی کی ایک خارجی علامت ہے۔ اسلام یہ چاہتاہے کہ اجتماعی زندگی میں لوگ ایک دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو برداشت کریں، حج کے زمانہ میں اس کی خصوصی تربیت ہوتی ہے۔ مختلف قسم کے لاکھوں لوگ بیک وقت ایک مقام پر جمع ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ حج کے دنوں میں خصوصی طور پر لازم کر دیا گیا کہ غصہ، بد کلامی، مار پیٹ، کسی جان کو تکلیف پہنچانا، بے حیائی اور بد دیانتی کے کام سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ اللہ سے بہتر سلوک پانے کے شوق میں بندوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔

حج خدا رخی زندگی گزارنے کا سبق ہے۔ وہ آخرت کے ہولناک دن کو یاد دلاتا ہے۔ وہ خدا کے لئے سرگرم ہونے کا ریہرسل ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آدمی کو خدا کے راستہ میں جدوجہد کرنے والا بننا چاہئے۔ وہ انسان کو بتاتا ہے کہ تمھارا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے اس کو کبھی اپنے قریب آنے کا موقع نہ دو۔ اس کا پیغام ہے کہ اللہ کے انعامات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اللہ کے لئے اپنے جان و مال کو قربان کر دو۔ وہ عملی حالات پیدا کر کے بتاتا ہے کہ مختلف انسانوں کو ایک دوسرے کی ناخوش گواریوں کو برداشت کرتے ہوئے انصاف اور خیر خواہی کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہئے۔ وہ انسانی مساوات کا عظیم الشان مظاہرہ ہے غرض حج ایک ایسی مکمل عبادت ہے کہ آدمی اگر اس کو صحیح طور پر انجام دے لے تو اس کے تمام معاملات درست ہو جائیں۔ خواہ یہ معاملات خدا سے متعلق ہوں یا انسانوں سے متعلق۔

آخرت کی دنیا

قطب جنوبی کے سمندروں میں برف کے بہت بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ (Iceberg) کہا جاتا ہے۔ یہ برفانی پہاڑ سطح سمندر پر تیرتے رہتے ہیں۔ ان کے حجم کا دس میں تقریباً نو حصہ پانی کے اندر ڈوبا رہتا ہے اور صرف ایک حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ مثال ہماری زندگی کی ہے۔ خدا نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کی عمر کا الگ بھگ سو سال موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں ڈال دیا۔ ہم ماں کے پیٹ میں پرورش پاکر اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں۔ اور پھر بچپن، جوانی اور بڑھاپا کے مرحلوں سے گزر کر مرجاتے ہیں۔ تاہم موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں۔ موت ہم کو دوبارہ ایک نئے پیٹ، کائنات کے پیٹ میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد انسان ایک اور عالم میں آنکھ کھولتا ہے۔ یہ آخرت کا عالم ہے۔ موجودہ دنیا عارضی ہے، آخرت کی دنیا ابدی ہے۔ موجودہ دنیا کی تکلیفیں بھی معمولی ہیں اور لذتیں بھی معمولی۔ مگر اگلی دنیا میں دونوں چیزیں اپنی آخری انتہا پر ہوں گی۔ وہاں جس کے حصہ میں تکلیف آئے گی، وہ بدترین عذاب میں ہمیشہ کے لئے تڑپتا رہے گا۔ جس کے حصے میں راحتیں آئیں گی، وہ کمال درجہ کی راحتوں میں ابدی طور پر خوشیوں اور لذتوں کا لطف اٹھاتا رہے گا۔

امتحان کی مصلحت کی بنا پر آخرت کی دنیا کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے گرد و پیش

آدمی اگر یہ جان لے کہ موت کے دوسری طرف بھی ایک دنیا ہے جو زیادہ مکمل ہے تو موجودہ زندگی اس کے لئے بے حد بامعنی ہو جائے گی۔ وہ اپنی جدوجہد کی منزل کو پالے گا۔ اس کی زندگی —— آخرت رخی زندگی (Akhirat Oriented Life) ہو جائے گی جو بالآخر ایک شاندار کامیابی پر ختم ہوگی۔ اس کے برعکس جو شخص موت کے بعد آنے والی دنیا کو نہ دیکھ رہا ہو اس کی زندگی دنیا رخی زندگی ہوگی۔ اس کی کوششیں اسی دنیا میں بھٹکتی رہیں گی۔ مرنے کے بعد جب وہ اگلی وسیع تر دنیا میں داخل ہوگا تو اچانک اس کو معلوم ہوگا کہ یہاں کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (بقرہ ۲۰۰)
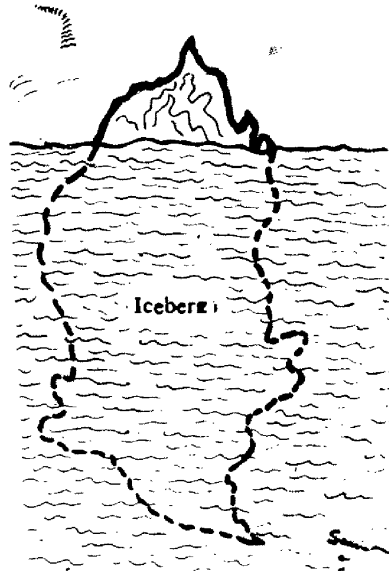
ایسی نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آخرت کی دنیا کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایک کمرہ ہے۔ اس میں کچھ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیوار، فرنیچر، آدمی وغیرہ کی صورت میں جو چیزیں کمرہ کے اندر نظر آرہی ہیں، بظاہر وہی کمرہ کی کل دنیا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور دنیا وہاں موجود نہیں۔ لیکن جب کمرہ میں رکھا ہوا ٹیلی وژن سٹ کھولا جاتا ہے تو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اس دنیا کے اندر ایک اور دنیا اپنے تمام اجزاء کے ساتھ موجود تھی۔ اس میں حرکت تھی، آوازیں تھیں۔ اس میں انسان جیسی ہستیاں تھیں۔ اس میں واقعات ہو رہے تھے۔ یہ سب مکمل طور پر موجود تھا مگر وہ دیکھنے والوں کے لئے غیر موجود بنا ہوا تھا۔ جب ٹیلی وژن کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور مکمل دنیا موجود تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ ہم کو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ ایک معلوم مثال ہے جس سے آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہماری دنیا ایک دہرا وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور دنیا چھپی ہوئی ہے۔ یہ آخرت کی دنیا ہے۔ ہم اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ نظر آنے والی دنیا میں گزارتے ہیں۔ اس کے بعد موجودہ دنیا میں ہماری آنکھ بند ہو جاتی ہے اور ہم کو ایک اور دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ وہ آئندہ آنے والی دنیا میں کامیابی حاصل کرے۔ کیوں کہ وہ دنیا ابدی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ اُس دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کے مقابلہ میں موجودہ دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

موجودہ دنیا میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی صرف اس لئے ہے کہ انسان حالت امتحان میں ہے۔ یہاں آدمی کو جانچ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا ہے، کون برا۔ اس جانچ کے لئے آزادانہ فضا ضروری تھی۔ ضروری تھا کہ آدمی کو اس بات کا کھلا موقع دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے رہے اور جس قسم کی چاہے زندگی گزارے۔ موجودہ ابتدائی دنیا اسی خاص ضرورت کے تحت خاص ڈھنگ سے بنائی گئی ہے۔ وہ تمام حالات یہاں جمع کئے گئے ہیں جو کسی آدمی کو عمل کا موقع دینے اور اس کے بعد اس پر حجت قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس طرح لوگوں کو کسوٹی پر رکھ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اگلی دنیا میں عزت کی جگہ دیئے جانے کے قابل ہے اور کون اپنے ظلم اور نالائقی کی بنا پر اس کا مستحق ہے کہ اس کو ذلت کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ موجودہ دنیا میں دونوں قسم کے آدمی ملے جلے ہیں۔ آخرت کی دنیا میں دونوں کو ان کے آج کے ریکارڈ کے مطابق چھانٹ دیا جائے گا۔ ایک طرف تکلیفوں اور مصیبتوں کا جہنم ہوگا اور برے لوگوں کو اس میں پُرعذاب زندگی گزارنے کے لئے ڈال دیا جائے گا۔ دوسری طرف ہر قسم کی راحتوں اور خوشیوں کی جنت ہوگی اور نیک لوگوں کو اس کا دائمی وارث بنا دیا جائے گا کہ وہ اس میں اپنا ٹھکانا بنائیں اور خوشیوں بھری زندگی گزاریں۔

اب آخرت کے مسئلہ کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔

ایک مرتبہ میں ایک بڑے سرکاری افسر سے ملا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم لوگ ان کے شاندار بنگلہ کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "مولانا صاحب" اچانک انھوں نے کہا "ہم لوگوں کی زندگی بھی کیسی بری زندگی ہے۔ اب دیکھئے۔ کل صبح کو سورج نکلنے سے پہلے مجھے ہوائی اڈہ پر جانا ہے۔ فلاں ملک کی اعلیٰ سیاسی شخصیت کا ہوائی جہاز ہماری زمین پر اترے گا۔ مجھ کو نہ صرف اپنی نیند کو چھوڑ کر ہوائی اڈہ پر پہنچنا ہے بلکہ دل میں نفرت کے باوجود مسکرا کر ان کا استقبال بھی کرنا ہے"۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے لوگوں کی زندگیاں کس طرح دورخی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو کار اور کوٹھی اور عزت اور اقتدار ہے۔ مگر اس کا ایک اور پہلو ہے جو اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ چیزیں انھیں کن باتوں کے نتیجہ میں ملتی ہیں۔ اگر آپ کسی بڑے آدمی کے اندر جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس چمک دمک کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو سطحیت پر راضی کیا ہے، خوشامد، موقع پرستی، مصلحت پسندی، زمانہ سازی، بے ضمیری ظاہرداری، دوعملی، یہی وہ چیزیں ہیں جن کی قیمت ان کو ایک شاندار زندگی کی صورت میں ملتی ہے۔ ہر بڑے آدمی کی زندگی کے دورخ ہیں۔ ایک شاندار، دوسرا تاریک اور بے روح۔ وہ اپنے "انسانی وجود" کو قتل کرنے پر راضی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ "حیوانی وجود" کی سطح پر اس کو جاہ وحشم کی ایک زندگی حاصل ہوسکے۔

عام انسان کی زندگی کے بھی اسی طرح دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک مزدور مئی جون کی گرمی میں کھلی دھوپ میں کام کر رہا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینہ میں شرابور ہے۔ مگر اپنا کام کئے جا رہا ہے۔ وہ کیوں اپنے آپ کو مشقت کی آگ میں جلاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس "دھوپ" کا ایک "سایہ" بھی ہے۔ اس کی مزدوری کا ایک پہلو گرمی اور لو میں جھلسنا ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ شام کو چند روپے حاصل کرے گا جس سے اس کے بیوی بچوں کی ضرورتیں پوری ہوں گی اور وہ رات کو اطمینان کی نیند سوئے گا۔

کسی عمل کے دورخ ہونے کا یہ وہ پہلو ہے جو صرف دنیوی اعتبار سے پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کے اعتبار سے بھی عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ہر عمل جو آدمی اس دنیا میں کرتا ہے، اس کا ایک رخ وہ ہے جو دنیا میں نظر آتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو آخرت میں مترتب ہو رہا ہے۔ آج ہم اپنے عمل کے دنیوی پہلو کو بھگتتے ہیں۔ کل ہم اپنے عمل کے اخروی پہلو کو پائیں گے آج ہم زندگی کے ایک سمت میں کھڑے ہیں۔ اس لئے ہم کو اعمال کا ایک ہی رخ دکھائی دیتا ہے۔ قیامت ہم کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دے گی جہاں دونوں رخ ہمارے سامنے آجائیں گے۔ جس طرح دیوار کے اوپر کھڑا ہوا آدمی دیوار کے دونوں طرف دیکھتا ہے اسی طرح قیامت کے عالم میں پہنچ کر آدمی حقیقت کے دونوں رخ کو دیکھنے لگے گا۔ ایک طرف پچھلی زندگی کی پوری تاریخ بچپن سے موت تک لمبی فلم کی طرح اس کے سامنے کھلی ہوئی ہوگی۔ دوسری طرف اس کی اس بنائی ہوئی تاریخ کے اخروی نتائج بالکل برہنہ ہوکر آنکھوں کے سامنے کھڑے ہوں گے:

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (انفطار) اس دن آدمی جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا۔

دنیا کا کام دنیا میں رہ جائے گا اور آخرت کی زندگی کے لئے وہی چیز کارآمد بنے گی جو آخرت کے لئے کی گئی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک شخص نے ناجائز طور پر دوسرے کی زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر اس کی "قانونی خانہ پری" اتنی مکمل تھی کہ ظاہری طور پر اس کے خلاف فیصلہ دینا بھی مشکل تھا۔ آپ نے فرمایا "تمھاری ہوشیاری کی بنا پر اگر عدالت نے تمھاری موافقت میں فیصلہ دے دیا تو سمجھو کہ اس نے تم کو آگ کا ایک ٹکڑا دیا"۔ گویا اس آدمی کے عمل کا نتیجہ دنیوی اعتبار سے تو زمین کا ایک محبوب ٹکڑا تھا۔ مگر آخرت کے اعتبار سے وہ بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک شعلہ تھا۔ وہ اپنے عمل سے پیچھے کی دنیا میں زمین چھوڑ رہا تھا اور آگے آخرت کی دنیا میں آگ بھیج رہا تھا۔

اسی طرح نیک اعمال کا معاملہ بھی ہے۔ امام احمد نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول غصہ کے بارے میں نقل کیا ہے:

ما تجرع عبد جرعة من لبن او عسل خیر من جرعة غیظ	کسی بندہ نے غصہ کے گھونٹ سے بہتر دودھ یا شہد کا گھونٹ نہیں پیا۔

غصہ کو پی جانا دنیا کے اعتبار سے انتہائی کڑوا گھونٹ ہے۔ مگر اس عمل کا جو اخروی ثمنی ہے، وہ دودھ اور شہد سے بھی زیادہ میٹھا اور لذیذ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ گرمی کی شدت جہنم کی سانس کی وجہ سے ہوتی ہے (ان شدة الحر من فیح جھنم) اسی طرح حدیث معراج میں ہے کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو وہاں آپ نے چار نہریں دیکھیں۔ دو نہریں اندر بہتی تھیں اور دو باہر۔ جبریل نے بتایا کہ اندر اندر بہنے والی نہریں تو بہشت کے دریا ہیں اور اوپر اوپر بہنے والے نیل اور فرات۔ گویا موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا ایک ہی واقعہ کے دو پہلو ہیں۔ دنیوی پہلو حقیر اور عارضی ہے۔ اخروی پہلو بہتر اور مستقل۔ آج ہم دنیوی پہلو سے دوچار ہیں۔ موت کے بعد ہم اخروی پہلو سے دوچار ہوں گے۔

انسانی عمل کے اس دوگونہ پہلو کو حدیث معراج میں مختلف تمثیلات کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔

بستی میں ایک شخص ہے۔ اس نے اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنے لئے ہر قسم کی عزت اور خوش حالی جمع کر لی ہے۔ وہ جب کسی مجلس میں داخل ہوتا ہے تو اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجلس کا سردار آگیا ہے۔ اسی بستی میں دوسرا شخص ہے۔ وہ بالکل ناکام ہے، اپنی عمر کا بڑا حصہ گزار لینے کے باوجود وہ اپنی مفلوک الحالی کو ختم نہ کر سکا۔ اگر وہ مجلس میں آجائے تو کوئی اس کو اہمیت نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی آدمی مجلس میں آیا ہی نہیں۔

دونوں بظاہر ایک ہی قسم کے انسان ہیں۔ دونوں یکساں قسم کے ہاتھ پاؤں کے ساتھ آتے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی عزت یا اپنی مفلسی کا پشتارہ لے کر نہیں آتا۔ اس کے باوجود دونوں میں اتنا زیادہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ آدمی کا وہ دہرا وجود ہے جس کو "حیثیت" کہا جاتا ہے۔ ہر آدمی اپنے دکھائی دینے والے وجود کے ساتھ اپنی نہ دکھائی دینے والی حیثیت کو بھی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ ظاہری جسم آدمی کو پیدائشی طور پر ملتا ہے اور غیر محسوس حیثیت کو آدمی اپنی کوششوں سے بناتا ہے۔ اسی طرح آدمی کا ایک دنیوی وجود ہے اور ایک اخروی وجود۔ دنیوی وجود پیسے اور اقتدار سے بنتا ہے اور اخروی وجود خدا ترسی اور نیک عمل سے۔ آج کی دنیا میں آدمی اپنے دنیوی وجود کے ساتھ جی رہا ہے اور آخرت میں وہ اپنے اخروی وجود کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

کسی درخت پر کوئی پتھر اٹکا ہوا ہے، آپ اس کے نیچے سے گزرے، یکایک پتھر آپ کے اوپر گرا اور آپ کا سر ٹوٹ گیا، کیا آپ اس درخت پر خفا ہوں گے اور اس سے لڑائی کریں گے۔ نہیں، بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے یا اسپتال جا کر اپنا علاج کرائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے اور آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس کے اوپر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا بھی سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے اور اگر خود اس کا سر توڑ نہیں سکتے تو معاملہ کو عدالت میں لے جاتے ہیں اور وہاں اس کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال لیجئے۔ آم کا ایک بڑا درخت ہے جس پر فصل کے موقع پر ہزاروں کی تعداد میں پھل آتے ہیں۔ یہ پھل پکتے ہیں اور ایک ایک کر کے گر جاتے ہیں یا توڑ لئے جاتے ہیں، خود آم اپنے ایک پھل کو بھی نہیں کھاتا مگر کوئی شخص کبھی یہ کہتا ہوا نہیں سُنا گیا کہ "افسوس کہ آم نے اتنے پھل پیدا کئے مگر وہ خود اپنے پھل کو نہ کھا سکا" اس کے برعکس ایک آدمی زندگی بھر کی کمائی سے اپنے لئے ایک شاندار مکان بنائے اور مکان کی تعمیر مکمل ہوتے ہی مر جائے تو ہر دیکھنے والا شخص کہے گا کہ کیسا افسوسناک ہے یہ واقعہ کہ آدمی نے محنت کر کے ایک گھر بنایا اور اس کے اندر رہنا اس کو نصیب نہ ہوا۔

معلوم ہوا کہ درخت اور انسان میں بہت بڑا فرق ہے۔ درخت کوئی "برائی" کرتا ہے تو اس کو اس برائی کی سزا نہیں دی جاتی۔ اسی طرح درخت کوئی "نیکی" کرتا ہے تو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کو اس کی نیکی کا انعام دیا جائے، جب کہ انسان کے لئے ہم دونوں چیزیں چاہتے ہیں۔ ہمارا ذہن پکارتا ہے کہ انسان کوئی برا عمل کرے تو اس کو ضرور اس کی سزا دی جائے اور انسان کوئی اچھا عمل کرے تو ضرور اس کو اس کا انعام ملے۔

سارے انسانوں کی فطرت یہی مانگ رہی ہے اور تمام علوم متفقہ طور پر اس کی اہمیت کی تصدیق کرتے ہیں مگر کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چیز اس دنیا میں حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ہٹلر نے ایک ایسی جنگ چھیڑی جس میں پانچ کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے۔ کیا کوئی بھی حکومت ہٹلر کو اس کے اس جرم کی سزا دے سکتی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ہٹلر کو گولی مار کر ختم کر دیں حالانکہ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ ہٹلر اگر ۵ کروڑ بار زندہ ہو اور ۵ کروڑ بار گولی مار کر ہلاک کیا جائے تب بھی اس کی سزا مکمل نہیں ہوگی۔ پھر یہ معاملہ ہٹلر اور اسٹالن جیسے ظالموں کا ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی آدمی بھی جب کوئی جرم کرتا ہے تو اس کے جرم کے اثرات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ نہ کوئی دنیوی عدالت اس کے سارے پہلوؤں کی تحقیق کر سکتی اور نہ کوئی جیل خانہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دے سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص جو اس دنیا میں کوئی جرم کرتا ہے، وہ اپنے جرم کی حقیقی سزا پائے بغیر مر جاتا ہے۔ حالانکہ ساری انسانیت پکار رہی ہے کہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دی جائے۔

یہی معاملہ انعام کا بھی ہے۔ ایک شخص کو اقتدار ملے مگر اقتدار پا کر وہ فرعون نہ بنے بلکہ عام

انسانوں کی طرح اپنے کو ایک انسان سمجھے اور اقتدار کو لوگوں کی حقیقی خدمت میں لگائے، کیا اس دنیا میں اس کو اس عمل کا بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنی محنت سے دولت کمائے اور اس دولت کو غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں صرف کر دے کیا اس کو اس عمل کا انعام دینا ممکن ہے۔ ایک شخص علم میں کمال پیدا کرتا ہے اور اس علم کو انسانیت کی تعمیر میں لگا دیتا ہے، کیا اس کو اس خدمت کا معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک شخص کے ایک چھوٹے سے نیک عمل کا انعام دینا بھی اس دنیا کے محدود حالات میں ممکن نہیں۔ جس طرح ایک بُرا عمل بے شمار طریقوں سے انسان کے لئے مصیبت بنتا ہے۔ اسی طرح ایک نیک عمل بے شمار طریقوں سے انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا باعث ہوتا ہے۔ کون ہے جو اس کے اعداد و شمار جمع کر سکے اور اس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے۔

اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ اس دنیا میں آدمی بیماری، بڑھاپا، موت اور اس طرح کے دوسرے ناموافق قوانین سے بندھا ہوا ہے۔ بالفرض کسی کے حسن عمل کا اندازہ کر کے اس کے لئے اس کے کارناموں کے مطابق ایک "جنت" بنا دی جائے، جب بھی وہ اس سے حقیقی طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بے شمار انسانوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بالفرض کسی کو مسرت مل جائے، جب بھی وہ چند لمحات سے زیادہ اس کا لطف نہیں اُٹھا سکتا۔ ہر انسان اپنے لئے ایک "جنت" چاہتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جنت نہیں بن سکتی۔ جنت بنانے کے لئے کوئی اور دنیا درکار ہے جو محدودیتوں اور نقائص سے پاک ہو۔

یہ صورت حال پکار رہی ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے اور اس دنیا کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا وجود میں آنی چاہیئے۔

جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ بے پناہ حد تک وسیع معلوم ہوتی ہے۔ اس کے امکانات لامحدود ہیں۔ یہ زمین، جس پر انسان اپنی زندگی بناتا ہے، وہ عظیم کائنات کے اتھاہ امکانات کا ایک بے حد حقیر حصہ ہے۔ ہماری زمین، کائنات کا اس سے بھی زیادہ چھوٹا حصہ ہے جتنا سارے سمندروں کے کنارے پائی جانے والی ریت کے مقابلہ میں ایک ذرہ۔

کائنات نے اپنے اتھاہ امکانات میں سے صرف ایک حقیر جزو ہی کو زمین پر کیوں ظاہر کیا۔ آخرت کا عقیدہ اسی سوال کا جواب ہے۔ انسان کے لئے یہاں جو امکانات ہیں، ان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ موجودہ دنیا میں ہم کو مل رہا ہے اور اس کا آخری اور کامل حصہ آخرت کی دنیا میں دیا جائیگا۔

آخرت کا نظریہ ان تمام بہترین آرزوؤں اور تمناؤں کو بامعنی بناتا ہے جن کو ایک آدمی اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوتا ہے۔ مگر ساری کوشش کے باوجود ان کو واقعہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اگر وہ ہر قسم کے ناموافق حالات کا مقابلہ کرتا ہوا بالفرض اپنے لئے ایک پسندیدہ زندگی بنائے تب بھی بڑھاپا اور موت اس کی ہر کامیابی کو بہت جلد بے معنی بنا دیتے ہیں۔ آخرت کا عقیدہ بتاتا ہے کہ اس کے خوابوں کی دنیا کہاں ہے اور اس کی مطلوبہ "جنت"، کس سمت میں ہے جدھر اس کو دوڑ دھوپ کرنی چاہیئے۔ آخرت آدمی کی منزل کو بھی بتاتی ہے اور اس کی جدوجہد کے صحیح رخ کو بھی۔

ہدایت کا انتظام

خدانے انسان کی ہدایت کے لئے غیر معمولی انتظامات کیئے ہیں پیغمبر کے ذریعہ اپنی کتاب اتاری ہے۔ کائنات میں بے حساب پیمانہ پر اپنی نشانیاں پھیلا دی ہیں۔ اسی کے ساتھ خدا کے فرشتے ہر قدم پر کھڑے ہوئے خاموش زبان میں اس کو بتاتے رہتے ہیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔

ایک بزرگ کو ان کے پڑوسی نے تکلیف پہنچائی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہو گئے "اب میں نہ اس سے بات کروں گا اور نہ اس سے تعلقات رکھوں گا" انھوں نے اپنے دل میں سوچا۔ اس کے اگلے دن اتفاق سے ان کے لڑکے سے بھی ان کو ایک تکلیف پہنچی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہوئے اور غصہ میں گھر سے باہر نکل آئے۔ رات تک ان کا غصہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ سو گئے۔ اگلی صبح کو سو کر اٹھے تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کے دل میں اپنے بچے کے لئے دوبارہ وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو بلایا اور لطف و محبت کے ساتھ اس سے بات کر کے کل کے غصہ کی تلافی کی۔

"اگر میں اپنے لڑکے کا قصور معاف کر سکتا ہوں تو کیا اسی طرح میں اپنے پڑوسی کا قصور معاف نہیں کر سکتا" ان کے دل میں خیال آیا' اور اچانک انھیں محسوس ہوا کہ لڑکے کی غلطی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں سبق دیا ہے۔ "اولاد جن مصلحتوں کے تحت دی جاتی ہے ان میں سے ایک مصلحت شاید یہ بھی ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ وہ کس طرح ایسا کر سکتا ہے کہ ایک قصوروار کا قصور معاف کر دے۔ اگر آدمی کو اولاد نہ دی جاتی تو اس اخلاقی محبت کا عملی سبق کسی اور طرح اس کو نہیں دیا جا سکتا تھا" اس کے بعد انھوں نے اللہ سے معافی مانگی اور اپنے پڑوسی سے مل کر اس کو خوش کیا۔

اگر آدمی کے سینہ میں ضمیر زندہ ہو اور وہ خدا کے سامنے پیش ہونے سے ڈرتا ہو تو اسی طرح ہر دن وہ اپنے گرد و پیش خدا کی آواز سنتا ہے۔ وہ ہر موڑ پر دیکھ سکتا ہے کہ خدا کے فرشتے کھڑے ہوئے بتا رہے ہیں کہ اس کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آواز صرف ان لوگوں کو سنائی نہیں دیتی جن کے کان خدا کی آواز سننے کے لئے بہرے ہو چکے ہیں۔ وہ خدا کی آواز صرف اس وقت سنیں گے جب اسرافیل کی چنگھاڑ ان کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

ایک بزرگ ایک شخص کے یہاں مہمان ہوئے۔ اس آدمی کے گھر سے ملی ہوئی مسجد تھی جس میں نمازی بہت کم آتے تھے۔ بزرگ نے اپنے سکون کی خاطر مسجد میں قیام کو پسند کیا۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ عرصہ سے اس کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ یہ برسات کا زمانہ تھا۔ اس لئے ٹپکنے سے اور بوچھار سے مسجد کی صفیں جگہ جگہ سے بھیگ گئی تھیں اور ان میں بو بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اگلے دن سورج نکلا تو بزرگ نے ساری صفیں نکال کر باہر دھوپ میں پھیلا دیں۔ مسجد میں خوب صفائی کی۔ اس کے بعد صفوں کو سکھا کر اور جھاڑ کر اپنی جگہ دوبارہ بچھا دیا۔

بزرگ جب پہلی بار مسجد میں داخل ہوئے تھے تو اس کی حالت دیکھ کر انھیں سخت انقباض ہوا تھا۔ اب جو وہ

اس کی صاف ستھری فضا میں بیٹھے تو ان کے دل کو ایک خاص طرح کی خوشی محسوس ہوئی۔ انھوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انھیں اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

عین اس وقت ان کے میزبان آگئے۔ "اس شخص سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ مسجد کی صفائی کرے۔" اس کو دیکھتے ہی ان کے اندر یہ احساس ابھرا "یہ دین کے اوپر لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے۔ مگر عمل کا یہ حال ہے کہ اپنے پڑوس کے خانہ خدا کو درست نہیں کر سکتا۔" اس احساس نے بہت جلد ان کے لاشعور میں یہ جذبہ ڈال دیا کہ میں دین میں اس سے زیادہ ہوں۔ میری دین داری کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔"

دن گزر گیا۔ شام کو وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی شخص اندر داخل ہوا۔ اس کا دبلا پتلا چہرہ اور اس کے پھٹے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی غریب مسافر ہے۔ بزرگ نے اس کے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام تو کہا مگر دل میں سوچا "یہ شخص بھی کتنا بے وقت آیا ہے، اب اس کے لئے رات کے کھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ رات بھی شاید وہ اسی مسجد میں گزارے اور میری تنہائی میں خلل ڈالے۔" ابھی وہ اسی انقباض میں تھے کہ ان کے میزبان مسجد میں داخل ہوئے۔ مسافر کو دیکھ کر انھوں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کو سلام کیا، اور مسکراتے ہوئے پوچھا کہاں سے آنا ہوا۔" پھر اس کے حالات معلوم ہونے کے بعد خود ہی بولے "آج آپ یہیں قیام کریں اور ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔" میزبان نے یہ ساری باتیں اس طرح کہیں گویا یہ نو وارد ایک غریب مسافر نہیں، ایک نعمت ہے جو خدا نے اس وقت خصوصی طور پر ان   ا ہے۔ ×

اس واقعہ کے بعد بزرگ نے محسوس کیا کہ ان کے دل میں نئی ہلچل پیدا ہو رہی ہے "مسجد کی صفائی کے معاملہ میں میں نے اپنے میزبان پر سبقت کی تھی۔ مگر مسافر کی خدمت کے معاملہ میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔" انھوں نے اپنے دل میں کہا "اگر میرے اندر ایک خصوصیت ہے تو میزبان کے اندر دوسری خصوصیت ہے، اور کیا معلوم مسجد کی صفائی کے مقابلے میں غریب مسافر کی خدمت اللہ تعالےٰ کو زیادہ پسند ہو۔" اس خیال کا آنا تھا کہ انھوں نے توبہ کی اور سجدہ میں گر کر اللہ سے دعا کی کہ وہ ان کو اور ان کے میزبان کو ہدایت دے اور اپنی رحمتوں میں حصہ دار بنائے۔

ہماری دنیا فتنوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ہر وقت اندیشہ ہے کہ آدمی کسی گڑھے میں جا گرے۔ مگر اوپر کے واقعات بتاتے ہیں کہ اللہ نے یہاں بچاؤ اور اصلاح کے بھی بے شمار مواقع رکھ دیئے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر ایمانی جذبہ زندہ ہو تو ہر فتنہ کے وقت اس کو اپنے قریب ہی ایک روشنی مل جائے گی جس سے فائدہ اٹھا کر وہ دوبارہ اپنے نجات کے راستہ کو پا سکتا ہے۔ مگر جب ایمان کی چنگاری بجھ جائے تو وہ بچاؤ کے الٰہی انتظام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاپاتا۔ وہ برابر پھسلن پر گرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس آخری گڑھے میں پہنچ جاتا ہے جس سے پھر آدمی کو نکلنا نہیں ہے:

جو خدا سے ڈرنے والے ہیں جب ان پر شیطان کا گزر ہوتا ہے، وہ چونک جاتے ہیں، پھر انھیں سوجھ آجاتی ہے اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ ان کو کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کسی طرح نہیں تھمتے۔ (اعراف ۲۰۲)

انسان کی تلاش

انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جہاں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پا سکے، جو عیب اور محدودیت سے خالی ہو۔ مگر موجودہ دنیا میں اس کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر سی وی۔ رمن ہندستان کے مشہور ترین سائنس داں ہیں۔ انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں ایم اے پاس کیا۔ ان کو سائنس کا نوبل انعام ملا۔ ان کی ایک سائنسی تحقیق (۱۹۲۸) نے رمن ایفیکٹ کے نام سے عالمی شہرت حاصل کی۔ بنگلور میں ان کے نام پر رمن انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ ان کو اپنے سائنسی مطالعہ میں اتنا انہماک رہتا تھا کہ وہ ملاقاتیوں کی آمد کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک آنے والے کے پرچۂ ملاقات کو دیکھ کر کہا: "یہ ملنے کے لئے آنے والے اس ابتدائی آداب کو بھی نہیں جانتے کہ مجھے تنہا رہنے دیں" ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو اکثر وہ "ایس" یا "نو" کہہ کر ریسیور رکھ دیتے۔ ان کے یہاں کثرت سے خطوط آتے تھے جن کو بس ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ پھاڑ کر پھینک دیتے تھے۔ سیاست دانوں کی بابت ایک بار انھوں نے کہا: "انڈیا میں کامیاب ہونے کے لئے آج کل جو چیز درکار ہے وہ صرف یہ کہ آپ کے سر پر ایک گاندھی ٹوپی ہو اور اس کے نیچے کچھ نہ ہو"۔ ڈاکٹر رمن کی خود اعتمادی اتنی بڑھی کہ انھوں نے مذہب کا بھی انکار کر دیا۔ انھوں نے ایک بار ایک اخباری نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: "نہ کوئی جنت ہے اور نہ کوئی دوزخ۔ اور نہ موت کے بعد آدمی کا کوئی وجود ہے"

مگر آخر عمر میں ڈاکٹر رمن سخت مایوسی کا شکار ہو گئے۔ نومبر ۱۹۷۰ میں اپنے انتقال سے کچھ پہلے انھوں نے کہا تھا "میری زندگی مکمل طور پر ایک ناکام زندگی رہی":

My life has been an utter failure (T.O.I. 21-1-1979)

ڈاکٹر رمن کو اتنا بڑا مقام حاصل ہونے کے باوجود یہ احساس کیوں ہوا کہ وہ مکمل طور پر ناکام ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے خوابوں کی دنیا کو نہ پا سکے۔ ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ملک میں سچی سائنس (True Science) قائم کریں۔ مگر جن ملکی سائنس دانوں سے انھوں نے کام لینا چاہا، ان کے متعلق ان کا تجربہ یہ رہا کہ وہ مغرب کی تقلید اور اس کی خیمہ برداری کے سوا اور کوئی مزاج نہیں رکھتے۔ وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس (بنگلور) کے ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے چاہا کہ نازی حکومت کے نکالے ہوئے جرمن سائنس دانوں کو بلائیں۔ مگر حکومت نے اپنے سیاسی مصالح کے تحت اس کی اجازت نہ دی۔ پھر انھوں نے طے کیا کہ خود اپنا جمع کیا ہوا تمام سرمایہ لگا کر ذاتی طور پر ایک سائنسی ادارہ قائم کریں۔ مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ حائل ہو گئی۔ ان کی رقم ایک پرائیویٹ بنک میں تھی جو دیوالیہ ہو گیا اور ان کی ساری رقم ڈوب گئی۔ وہ شخص جو اعلیٰ حوصلوں اور اونچی تمناؤں کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوا تھا وہ ایک انتہائی مایوس انسان کی حیثیت سے اس دنیا سے رخصت ہوا۔

یہ ایک "کامیاب مرد" کا قصہ تھا۔ اب ایک "کامیاب عورت" کا حال دیکھئے۔

"ہماری دنیا مکمل کیوں نہیں"

آدمی اس سوال کا جواب نہیں پا سکتا

جب تک وہ آخرت کی دنیا کو نہ جان لے

۱۶ سالہ نندنی اپنے وجے نگر کے مکان میں آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے نظر آیا کہ اس کی نازک گردن پر ایک گومڑا ابھر رہا ہے۔ "زندگی زیادہ مکمل اور بےعیب کیوں نہیں"

Why life could not have been more perfect.

اس نے اپنے دل میں کہا۔ وہ ایک کامیاب رقاصہ تھی اور اپنی دو ہم پیشہ بہنوں (پدما اور جے شری) کے ساتھ ابھی ابھی کشمیر کے ایک رنگا رنگ سفر سے یہ حوصلہ لے کر واپس آئی تھی کہ وہ اپنے پیشہ میں اور زیادہ توجہ دے کر اعلیٰ ترین رقاصہ بنے گی۔ اپنی بہنوں کے ساتھ اس نے ملک کے مختلف شہروں میں رقص کے ۱۵۰ مظاہرے کئے تھے۔ تینوں بہنیں "وجے نگر سسٹرس" کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔ تاہم کل کی تقریب میں شرکت سے اس نے معذوری ظاہر کر دی۔ بدنما گردن کے ساتھ وہ آرٹ کی محفل میں کیسے شریک ہو سکتی تھی۔

مگر خلاف امید اس کا گومڑ بڑھتا گیا۔ گھر والوں کو پریشانی ہوئی۔ ڈاکٹروں اور اسپتالوں کی دوڑ شروع ہو گئی۔ بالآخر صرف یہ جاننے کے لئے کہ ان کی نندنی کینسر کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اسپتال میں داخلہ کے نویں دن اس کی موت کا پیغام آ گیا۔ بستر پر ایک بے حس و حرکت جسم پڑا ہوا تھا اور دوست اور رشتہ دار چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے یہ سوچ رہے تھے "وہ ہنستی ہوئی روح آخر کہاں چلی گئی۔"

یہ جولائی ۱۹۶۹ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد نندنی کی بقیہ دو بہنوں نے "نرتیہ نندنی" کے نام سے ایک ڈانس اسکول کھولا۔ زندہ رہنے کے لئے کوئی مشغولیت ضروری تھی۔ دونوں باصلاحیت بہنوں کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کو موقع ملا کہ وہ یورپ کے شہروں لندن، جنیوا، فرینکفرٹ، برلن، ایمسٹرڈم، پیرس وغیرہ میں اپنے کمال فن کی داد لے سکیں۔ ان کو اپنے پیشہ میں اتنی کامیابی ہوئی کہ ایک اخبار نے لکھا:

The gods of India can smile when the bells on the Vijayanagar sisters tinkle.

ہندوستان کے دیوتا مسکرا اٹھتے ہیں جب وجے نگر بہنوں کے گھونگر و بجتے ہیں۔

فروری ۱۹۷۳ میں دونوں "رقص رانیوں" کی شادی روایتی جشن کے ساتھ ہو گئی۔

شادی کے صرف دو دن بعد جے شری کے آئینہ نے بتایا کہ اس کی ٹھوڑی کے پاس ایک گومڑا ابھر رہا ہے۔ دواؤں اور آپریشن کے بعد گھر والوں نے سمجھا کہ ان کی جے شری اچھی ہو چکی ہے۔ مگر مقررہ جگہ پر درد کا باقی رہنا جے شری کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ "بے وقوف نہ بنو جے شری"، ڈاکٹر نے کہا "تمہارے جیسی جوان اور تندرست عورت کو کینسر کس طرح ہو سکتا ہے۔" اس کے بعد گومڑ کا ایک ٹکڑا ٹاٹا میموریل اسپتال (بمبئی) کو جانچ کے لئے بھیجا گیا۔ رپورٹ نے بتایا کہ نندنی کے بعد اب اس کی بہن کو بھی کینسر ہو چکا ہے۔ مرض ٹھوڑی اور سینہ سے گزر کر بیروں تک پہنچ گیا۔ ہر قسم کے بہترین علاج کے باوجود تکلیف بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۴ کو جے شری کی روح بھی ایک بھیانک جسم کو بستر پر چھوڑ

کر اس سے جدا ہوگئی۔

"وجے نگر سسٹرس"، کا جگمگاتا ہوا مکان اب تاریک ہو چکا ہے۔ دو جوان لڑکیوں کے کھونے کے بعد ماں باپ کو زندگی بے معنی نظر آتی ہے۔ ہر طرف مایوسی پھیلی ہوئی ہے۔ "نرتیہ نندنی" اسکول اگرچہ نومبر ۱۹۷۵ سے "جے شری آرٹس انٹرنیشنل" میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مگر تیسری بہن پدما اپنی ظاہری کامیابیوں کے باوجود ہر آن اپنے کو اسی راستہ پر پاتی ہے جدھر اس سے پہلے اس کی دو محبوب بہنیں جا چکی ہیں۔ وہی سوال اس کو بھی بے چین کئے ہوئے ہے جس کو لے کر اس کی دونوں بہنیں اس دنیا سے چلی گئیں — "زندگی زیادہ مکمل اور بے عیب کیوں نہیں" اس کی نفسیاتی حالت کو رپورٹر (مسٹر ایس۔ گنگولی) نے ایک جملہ میں اس طرح ادا کیا ہے:

A psychological amputation is not less real than a physical one.
Eve's Weekly (Bombay) 2 6.1978

نفسیاتی قتل کسی بھی حال میں جسمانی قتل سے کم نہیں ہوتا۔

یہ کوئی اتفاقی مثال نہیں۔ ہمارا پورا سماج اسی قسم کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ لوگ جن کو آپ ہنستے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جو بظاہر کامیابیوں کی جگمگاہٹ میں زندگی گزارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کو بھی اندر سے جھانک کر دیکھئے تو خوش نما جسموں کے اندر ایک غم ناک اور اداس روح بسی ہوئی نظر آئے گی۔ موجودہ دنیا میں زندگی کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں، آدمی کو اتنے مختلف قسم کے ناموافق حالات میں رہنا ہوتا ہے اور دوسرے انسانوں کے چھیڑے ہوئے فتنے اس طرح سکون کو درہم برہم کرتے رہتے ہیں کہ کسی شخص کے لئے، ظاہری رونقیں اور ساز و سامان جمع کر لینے کے باوجود، حقیقی خوشیوں کی زندگی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

ایک شخص ضروریات زندگی کا محتاج ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی کی ضرورتیں اس کو حاصل ہو جائیں۔ جب وہ کوشش کر کے ضرورت کی چیزیں پالیتا ہے تو اب اس کو عیش و آرام کی طلب ہوتی ہے۔ اب ضرورت کی چیزوں میں اس کے لئے کوئی لذت نہیں ہوتی۔ اب وہ رات دن یہ خواب دیکھتا رہتا ہے کہ عیش کے سامان اس کے گرد جمع ہو جائیں۔ اگر حالات اس کا ساتھ دیں اور وہ عیش کی چیزیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی اس کی طلب ختم نہیں ہوتی۔ جن چیزوں کو پہلے وہ حرص کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا، اب ان میں اس کے لئے کوئی لذت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بعد اس کے اندر ایک اور چیز کی طلب جاگ اٹھتی ہے۔ یہ ہے عزت اور مرتبہ۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا مقام سب سے اونچا ہو جائے۔ مگر یہ چیز اس کو کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے حصہ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں آتا کہ جو لوگ اس کو اپنے سے کم تر دکھائی دیں ان پر اپنی بڑائی کا مظاہرہ کر کے اپنی ہوس کی تسکین حاصل کرے۔ اور جو لوگ اس کو اپنے سے اوپر دکھائی دیں ان کے خلاف حسد اور بغض کی آگ میں جلتا رہے۔ وہ انھیں تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اچانک اس کی موت آجاتی ہے اور وہ آخرت کی ابدی دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ دوبارہ اپنے لئے ایک زیادہ تلخ اور زیادہ تاریک زندگی کا آغاز کرے۔ دنیا کی کامیابیاں بھی اتنی ہی بے قیمت ہیں جتنی دنیا کی ناکامیاں۔ مگر انسان اپنی خوش خیالیوں میں گم رہتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس کو اس کی خوش خیالیوں کی دنیا سے باہر نکالنے والی ثابت ہو۔

دنیا میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو زندگی بھر ناکامی و نامرادی کے احساس سے دوچار رہتے ہیں۔ تاہم وہ لوگ جن کو دنیا میں بہترین مواقع ملے۔ جنھوں نے سمجھا کہ وہ اپنی خوشیوں کی بہاریں اسی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کا خاتمہ بھی اکثر بدترین مایوسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ حادثہ، بیماری، منصوبوں کا ناکام ہو جانا۔ اور اگر بالفرض کوئی ان ناخوش گواریوں سے بچ جائے تو آخر میں موت۔ کتنے لوگ ہیں جو "کامیابی کے ساتھ" اپنا سفر طے کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر موت عین اس وقت ان کی تمناؤں کے محل کو ڈھا دیتی ہے جب کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے دروازے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

کیا انسان کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ انتہائی قیمتی صلاحیتیں لے کر آئے اور بالآخر ایک بدترین ناکامی کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اگر آخرت کو حذف کر کے زندگی کو دیکھا جائے تو زندگی ایک المناک ڈرامے کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتی۔ ہم خواہ کچھ بھی کریں، موجودہ دنیا میں ہم اپنی آرزوؤں کی جنت تعمیر نہیں کر سکتے۔ ہماری محدودیتیں فیصلہ کن طور پر ہماری راہ میں حائل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف آخرت کا عقیدہ ہے جو انسانی زندگی کو بامعنی بناتا ہے۔ آخرت کے عقیدہ میں ہم اپنی اس منزل کو پالیتے ہیں جس کی طرف ہم یقین کے ساتھ سفر کر سکیں، جہاں ہم اپنی کوششوں کا انجام پانے کی قطعی امید کر سکیں۔ آخرت کو نہ ماننے والے کو اپنے سامنے مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جب کہ آخرت کو ماننے والا اپنے سامنے امیدوں کا اتھاہ مستقبل دیکھتا ہے۔ زندگی آخرت کے بغیر انتہائی بے معنی ہے مگر زندگی آخرت کے ساتھ اتنی بامعنی ہو جاتی ہے کہ انسانی زبان میں وہ الفاظ ہی نہیں جو اس کو بیان کر سکیں

ہالی وڈ (امریکہ) عیش پسندوں کے لئے دنیا کی سب سے بڑی جنت ہے۔ ساری دنیا کے "محروم" لوگ ان "پائے ہوئے" لوگوں پر رشک کرتے ہیں جن کو اس جنت ارضی میں کوئی حصہ ملا ہو۔ مگر ہالی وڈ کے ایک جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ بظاہر قابل رشک لوگ بے حد قابل رحم حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس جنت ارضی کے انتہائی خوش قسمت لوگ، سب کچھ پالینے کے بعد بالآخر اکتاہٹ Boredom کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے پاس اتنی کاریں ہوتی ہیں کہ بسا اوقات ان کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آج اپنی مختلف کاروں میں سے کس کار میں بیٹھ کر جائیں۔ تاہم ان کی بے اطمینانی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ آپس میں اپنے مکان حتیٰ کہ بیویوں کا تبادلہ کرتے ہیں تاکہ تنوع کے ذریعہ اپنی اکتاہٹ کو کم کر سکیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان لامحدود اطمینان چاہتا ہے۔ دنیا کی چیزیں اس کو صرف محدود اطمینان دیتی ہیں اس لئے وہ اس کی تسکین نہیں بنتیں۔ یہ صرف خدا ہے جو انسان کی طلب کا حقیقی اور ابدی جواب ہے۔

الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب — سن لو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

اللہ کی یاد کا مطلب یہ ہے کہ اس ہستی میں اپنا دل لگایا جائے جو حقیقی اور ابدی ہے۔ اپنی امیدوں اور حوصلوں کو اس عالم سے وابستہ کیا جائے جو ان تمام کمیوں سے پاک ہو گی جن کی وجہ سے موجودہ دنیا ہمارے خوابوں کی تعبیر نہیں بننے پاتی۔ جو آدمی اللہ کو پالیتا ہے وہ گویا اپنا سب کچھ پالیتا ہے۔ دنیا میں اگر اس کو تکلیف پہنچے تب بھی وہ مطمئن رہتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ جس راستہ پر چل رہا ہے وہ بالآخر اس کو منزل تک پہنچانے والا ہے۔

خدا — انسانی فطرت کی آواز ہے

مسٹر الطاف گوہر پاکستان کے چوٹی کے صحافی ہیں۔ وہ پاکستان کے اخبار ڈان کے ایڈیٹر تھے بھٹو حکومت (۷۷ - ۱۹۷۱) نے اپنے اقتدار کے ابتدائی زمانہ میں الطاف گوہر کو جیل خانہ میں ڈال دیا۔ جیل کا مطلب، سیاسی قیدیوں کے لئے، اپنے میدان عمل سے محرومی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عام طور پر سب سے بہتر مشغلہ یہ رہ جاتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف کرلے۔ الطاف گوہر نے قرآن کو ترجمہ کی مدد سے پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ مطالعہ، حیرت انگیز طور پر، ان کے لئے ایک نیا تجربہ ثابت ہوا۔ وہ زندگی کی نئی وسعتوں سے آشنا ہوئے جس سے اب تک وہ، اپنے صحافتی مشاغل کی ہماہمی میں بے خبر رہے تھے۔ وہ شخص جس کا قلم چند دن پہلے تک عالمی سیاست کا جائزہ لیا کرتا تھا، جو اپنی خداداد ذہانت کے ساتھ قلم کا شہسوار بنا ہوا تھا، جیل خانہ میں اس نے اپنے آپ کو اچانک بالکل بے بس پایا۔ اس کی دنیا ایک محدود کوٹھری تھی جہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

تنہائی کی زندگی، ہر معاملہ میں دوسروں پر انحصار، تمام ظاہری سہاروں کا رخصت ہو جانا، ان واقعات نے جیل کے ماحول کو الطاف گوہر کے لئے ایک عظیم حقیقت کے ادراک کی تربیت گاہ بنا دیا۔ ان کی فطرت، غیرارادی طور پر، ایک ایسی ہستی کو تلاش کرنے لگی جو ہر طاقت سے بڑھ کر طاقت ور ہو۔ جس کو آدمی ہر آن پا سکتا ہو۔ جو ہر حال میں آدمی کی چٹان بن سکے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ حالات اس کو دھکیل کر ایسے مقام پر پہنچا دیں جہاں اس کے اپنے کمزور وجود کے سوا کوئی اس کے پاس نہ ہو، جہاں اس کے تمام سہارے اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔

اس نازک لمحہ میں جب مسٹر الطاف گوہر نے قرآن کی سورہ فاتحہ کھولی اور اس کو پڑھتے ہوئے اس فقرہ تک پہنچے: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ، تو اچانک ان پر کھلا کہ وہ ہستی فی الواقع کائنات میں موجود ہے جس کی تلاش ان کی فطرت کا سب سے بڑا سوال بنی ہوئی تھی۔ سورہ کی آیت نمبر ۴ میں ان کو انسان کی حقیقی عظمت اور آزادی کا راز مل گیا۔ یہاں بندہ اپنے خدا کے ساتھ ایک ایسے ابدی عہد میں وابستہ نظر آیا جو مکمل طور پر اس کے عجز کا بدل بن جاتا ہے، جو اس کو ایک اتھاہ طاقت کی دائمی سرپرستی میں دے دیتا ہے۔ الطاف گوہر اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

I remember vividly the moment when I first realized the significance of this verse. 'We worship you alone, and to you alone we turn for help. It was a dramatic moment of freedom, a moment in which fear dis appeared, and within me I felt a resurgence of confidence and faith.

مجھے وہ لمحہ خوب یاد ہے جب کہ میں نے پہلی بار اس قرآنی فقرہ کی معنویت کو سمجھا "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں" یہ آزادی کا ایک ڈرامائی لمحہ تھا، ایک ایسا لمحہ جس کے بعد خوف مٹ گیا، اور میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر ایک نیا اعتماد و یقین ابھر آیا ہے۔

خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔ عام حالات میں یہ آواز چھپی رہتی ہے۔ مگر جب زندگی میں کوئی نازک لمحہ آتا ہے تو یہ آواز جاگ اٹھتی ہے۔ تاریخ میں بے شمار مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسان اس فطرت سے خالی نہیں۔

فرانس کی ایک فلم ایکٹرس گانا لولوبرایگیڈا (Gina Lollobrigida) جنوری ۱۹۷۵ میں ہندستان آئی تھی۔ ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری رپورٹر سے اس کا سوال و جواب یہ تھا:

> To a question whether she believed in God, Gina said: I believe in God. I believe in God. more when I am on an aeroplane.
>
> Times of India, 3.1.1975

ایک سوال کے جواب میں کہ کیا وہ خدا کو مانتی ہے، گانا نے کہا: میں خدا کو مانتی ہوں، میں خدا کو مانتی ہوں، اس وقت اور بھی زیادہ جب میں ہوائی جہاز میں ہوتی ہوں۔

آدمی جب ہوائی جہاز میں اڑ رہا ہو تو اس وقت وہ مکمل طور پر ایسے خارجی اسباب کے رحم و کرم پر ہوتا ہے جن کے توازن میں معمولی فرق بھی اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ انسان کی یہی بے چارگی سمندری سفروں میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: "کیا تم دیکھتے نہیں کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے، تاکہ وہ تمھیں اپنی قدرتیں دکھائے۔ درحقیقت اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لئے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔ اور جب سمندر میں ان لوگوں کو موجیں بدلیوں کی طرح گھیر لیتی ہیں تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں، اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کرکے۔ پھر جب وہ بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اعتدال پر رہتا ہے۔ اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا ہے جو بدعہد اور ناشکرا ہے۔ (لقمان ۳۱-۳۲)

کوئی شخص خواہ کتنا ہی سرکش اور منکر کیوں نہ ہو، جب مشکل حالات پڑتے ہیں تو وہ بے اختیار خدا کو پکار اٹھتا ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔

۲۔ روسی ڈکٹیٹر مارشل اسٹالن (۱۸۷۹-۱۹۵۳) خدا کا منکر تھا۔ مگر اس کی زندگی میں ایسے واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ مشکل اوقات میں وہ بے اختیار خدا کو یاد کرنے لگتا تھا۔ ونسٹن چرچل (۱۸۷۴-۱۹۶۵) نے دوسری جنگ عظیم کے موقع پر اگست ۱۹۴۲ء میں ماسکو کا سفر کیا تاکہ ہٹلر کے خلاف دوسرا محاذ (سکنڈ فرنٹ) قائم کرنے کے لئے روسی لیڈروں سے گفتگو کرے۔ چرچل نے اس سلسلہ میں اتحادیوں کا فوجی منصوبہ اسٹالن کے سامنے رکھا جس کا خفیہ نام ٹارچ (TORCH) رکھا گیا تھا۔ اسٹالن چونکہ خود بھی ہٹلر کی بڑھتی ہوئی یلغار سے خائف تھا، اس نے اس فوجی منصوبہ میں گہری دلچسپی لی۔ چرچل کا بیان ہے کہ منصوبہ کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب کہ اسٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں اس کی زبان سے نکلا:

> May God prosper this undertaking

خدا اس منصوبہ کو کامیاب کرے۔

> Winston S. Churchill,
> The Second World War (Abridgement)
> Cassell & Company
> London, 1965, P. 603

۳۔ سابق صدر امریکہ مسٹر رچرڈ نکسن کے افراد خاندان جب آخری فوٹوگراف کے لئے وائٹ ہاؤس میں جمع ہوئے تو سرکاری فوٹوگرافر کو ان کا فوٹو لینے میں کافی دیر لگی کیونکہ صدر نکسن سمیت سب لوگ رو رہے

تھے اور فوٹوگرافر اس انتظار میں تھا کہ بغیر آنسوؤں کا کوئی لمحہ ملے تو شاٹ لے سکے۔

واٹر گیٹ سکینڈل کے متعلق ٹیپ ریکارڈنگ جس نے نکسن کی صدارت کو ختم کیا، اگر نکسن چاہتے تو اس کو ضائع کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی صدارت خطرہ میں نہ پڑتی۔ مگر صدر نکسن کو یہ لالچ تھا کہ صدارت کے بعد اس ٹیپ کو فروخت کر کے وہ معقول رقم حاصل کر سکتے ہیں، مگر ان کی یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ٹیپ ریکارڈنگ لوگوں کے علم میں آگئی اور نکسن کی صدارت ایسے بھونچال کا شکار ہوئی کہ علیحدگی کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔

واٹر گیٹ اسکینڈل کے انکشاف سے پہلے رچرڈ نکسن اتنا زیادہ پریشان تھے کہ نیم پاگل ہو گئے تھے۔ وہ وائٹ ہاؤس میں روتے رہتے۔ انھوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اگرچہ سخت نگرانی کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آخری ایام 'The Final Days' نامی کتاب میں انکشاف کیا گیا ہے کہ:

As the end neared, Nixon asked secretary of state Henry Kis-singer to kneel and pray with him. saying :

"You are not a very orthodox Jew and I am not an orthodox Quacker, but we need to pray."
Daily American (Rome) 27.3 1976

جب صدارت کا خاتمہ قریب آگیا، نکسن نے سابق سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ خدا کے آگے جھکیں اور دونوں مل کر دعا کریں۔

" نہ تم زیادہ پکے یہودی ہو نہ میں زیادہ پکا عیسائی۔ مگر اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ ہم دعا کریں " نکسن نے کہا اور عیسائی طریق عبادت کے مطابق جھک کر دعا کرنے لگے۔

۴۔ روس میں اشتراکی انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس طرح اس انقلاب پر اب پورے ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ تازہ اعداد و شمار کے مطابق ۲۵ کروڑ سوویت شہریوں میں ۲۲ کروڑ ایسے لوگ ہیں جو اکتوبر انقلاب کے بعد پیدا ہوئے ہیں، دوسرے لفظوں میں ایسے سماج میں جس میں، حکومت روس کے دعوے کے مطابق، قدیم مذہبی نظام مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔

اشتراکی نظریہ کے مطابق مذہب، سرمایہ داری نظام کا ضمیمہ تھا۔ سرمایہ داری نظام کے خاتمہ کے بعد قدرتی طور پر اس کے ضمیمہ کو بھی ختم ہو جانا چاہئے۔ روسی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے سرمایہ داری نظام کو روس سے ختم کر دیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ مذہب اب بھی وہاں زندہ ہے۔ حتیٰ کہ روس کی جدید نسل میں دوبارہ مذہب پروان چڑھ رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ وہ ہے جو ۱۹۷۴ میں ہندستان میں پیش آیا۔ ایک روسی جہاز (Iyushin Jet) ہندستان میں مغربی بنگال کی فضا پر اڑ رہا تھا کہ اس کا انجن خراب ہو گیا ہوا باز کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں اور جہاز زمین پر گر پڑا ــ ہوا باز سمیت سارے مسافر جل کر ختم ہو گئے۔

چونکہ یہ حادثہ ہندستان کی سرزمین پر ہوا تھا اس لئے بین اقوامی قانون کے مطابق ہندستان کو اس کی تفتیش کرنی تھی۔ ہوائی جہازوں کا قاعدہ ہے کہ اس میں آواز ریکارڈ کرنے والی ایک خودکار مشین رکھی جاتی ہے جس کو عام طور پر (Black Box) کہتے ہیں۔ یہ

بلیک باکس ہوا باز اور کنٹرول ٹاور کے درمیان گفتگو کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ اس کو ہوائی جہاز کی دُم میں رکھا جاتا ہے تاکہ ہوائی جہاز کے جلنے کے بعد بھی وہ بچ سکے۔

ہندستانی افسروں نے ہوائی جہاز کے ملبہ سے اس بلیک باکس کو حاصل کیا۔ جب اس بکس کا ٹیپ بجایا گیا تاکہ اس سے تفتیش میں مدد لی جاسکے تو معلوم ہوا کہ بالکل آخری لمحات میں روسی ہوا باز کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا:

Peter Save Us

(سینٹ پیٹر ہم کو بچا) واضح ہو کہ پیٹر یا پطرس حضرت عیسیٰ ؑ کے بارہ حواریوں میں سے ایک تھے اور عیسائیوں کے یہاں بڑے بزرگ مانے جاتے ہیں۔

۵. کون جانتا تھا کہ سٹالن کی اپنی لڑکی سویتلانہ (Svetlana Alliluyena) اس کے بعد عیسائی مذہب قبول کرے گی۔ سویتلانہ اشتراکی دنیا سے مایوس ہو کر ہندستان آئی تھی ۔ ہوسکتا تھا کہ وہ کسی ہندستانی مذہب میں پناہ لے۔ مگر ہمارے حکمرانوں کے لئے اس کا یہاں رہنا ہند۔ روس دوستی کے خلاف معلوم ہوا۔ چنانچہ مجبور ہو کر وہ یورپ چلی گئی، اور وہاں عیسائیت کو اختیار کر لیا۔

سویتلانہ اپنی کتاب Only One Year (صرف ایک سال) میں لکھتی ہے کہ میں ماسکو ہی میں غیر مطمئن تھی اور اپنے قلب کی تسکین کے لئے کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھی ــــ وہ چیز مجھے بائبل کے ان جملوں میں مل گئی:

خداوند میری روشنی اور میری نجات ہے مجھے کس کی دہشت۔

خداوند میری زندگی کا پشتہ ہے، مجھے کس کی ہیبت۔

خواہ میرے خلاف لشکر خیمہ زن ہو۔
میرا دل نہیں ڈرے گا۔
خواہ میرے مقابلہ پر جنگ برپا ہو۔
تو بھی میں خاطر جمع رہوں گا۔

زبور: ۲۷

۶. آج کے روس میں اس کیفیت کے ابھرنے کے شواہد کثرت سے مل رہے ہیں۔ سولژنتسین اور سخاروف اسی روحانی کش مکش کی ایک علامت ہیں۔ سولژنتسین کو اگر نوبل انعام حاصل کرنے کی اجازت مل ہوتی تو وہ اس رقم کو روسی عوام کے لئے ایک گرجا تعمیر کرنے میں صرف کرتا۔ سولژنتسین کے ایک قریبی دوست ویلتری پیینی سے پوچھا گیا کہ روسی سلطنت کا سب سے کمزور پہلو کیا ہے۔ اس نے بلا تردد جواب دیا:

The hunger of ordinary people for moral ond spritual truth.

"عام انسان کی یہ بھوک کہ وہ اخلاقی اور روحانی سچائی کو پاسکے"

جو شخص گھمنڈ اور عصبیت جیسی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو وہ کبھی سچائی کو دیکھ نہیں سکتا، خواہ وہ کتنی ہی کھلی شکل میں اس کے سامنے رکھ دی گئی ہو۔ سچائی کو پانے کے لئے سچائی کا طالب ہونا ضروری ہے۔

نماز سے آغاز

مولانا محمد علی ایم اے (کینٹب) اپنی تفسیری کتاب میں لکھتے ہیں: "ایک دفعہ راقم الحروف کے یہاں بہت سے احباب جمع تھے۔ ان میں لالہ لاجپت رائے بھی تھے۔ وہ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ مولوی صاحب! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ جس قوم کے پاس نماز اور زکوٰۃ جیسے دو بے مثال ادارے (Institutions) ہوں وہ قوم کیوں ذلیل و خوار ہو" قرآنی دعوت انقلاب، ۱۹۵۱، مکتبہ شعر و ادب لاہور، صفحہ ۳۱۶

نماز اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دینے کا نام ہے اور زکوٰۃ کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں اپنے مال کو قربان کرنا جو ان دونوں عبادتوں کو حقیقی طور پر اپنی زندگی میں شامل کرلے، اللہ اس سے راضی ہوجاتا ہے اور اس کو ابدی جنت میں جگہ دیتا ہے۔

یہ نماز اور زکوٰۃ کا اخروی پہلو ہے اور یہی ان کا اصل مقصود ہے۔ تاہم ان عبادتوں کے زبردست دنیوی فائدے بھی ہیں۔ نماز اگر صحیح شعور کے ساتھ قائم کی جائے تو وہ سارے مسلمانوں کو ایک مرکز پر متحد کر دیتی ہے اور اتحاد بلاشبہ کسی قوم کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ زکوٰۃ وسیع ترین قسم کا سوشل انشورنس ہے۔ کسی مسلم گروہ میں زکوٰۃ کا نظام اگر پوری طرح قائم ہوجائے تو اس کے اندر سے یہ مسئلہ سرے سے ختم ہوجاتا ہے کہ اس کے کچھ افراد مالیاتی کمی کے سبب سے اپنے لئے قابل اعتماد معاشی بنیاد نہ پاسکیں۔ زکوٰۃ کا نظام اس بات کی ضمانت ہے کہ قوم کا صرف ایک حصہ خوش حال نہ ہو بلکہ پوری قوم مجموعی حیثیت سے ترقی کرے۔

نماز اور زکوٰۃ، دنیوی اعتبار سے، اتحاد اور فارغ البالی کی علامتیں ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں جس قوم میں پیدا ہوجائیں، وہ بلاشبہ عزت و سربلندی حاصل کرے گی۔ کوئی اس کی کامیابی کو روک نہیں سکتا۔

نماز آدمی کے اوپر خدا کے حقوق کو بتاتی ہے اور زکوٰۃ آدمی کے اوپر آدمی کے حقوق کو۔ خدا کا حق آدمی کے اوپر یہ ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائے۔ آدمی کا حق آدمی کے اوپر یہ ہے کہ وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ یہ دونوں چیزیں اتنی بنیادی ہیں کہ اگر وہ کسی قوم کے افراد میں پیدا ہوجائیں تو اس کے سارے معاملات کو درست کر دیتی ہیں۔ خدا کے آگے جھکنا نہ صرف اس کو خدا کی نظر میں محبوب بناتا ہے اور خدا اس پر اپنے انعامات کے دروازے کھول دیتا ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ اس کے اندر وہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو ہر قسم کی دنیوی ترقی کے ضامن ہیں۔ خدا کے آگے جھکنا اپنے رب کے سامنے اپنی عبدیت کا اقرار ہے اور عبدیت کا شعور جن لوگوں میں زندہ ہوجائے ان کا معاملہ جب دوسرے انسانوں سے پڑتا ہے تو یہ شعور وہاں تواضع، بے غرضی، انصاف پسندی اور حق کے لئے سپر اندازی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ نہ صرف بندے کے اوپر بندے کے حق کو یاد دلاتی ہے بلکہ یہ سبق دیتی ہے کہ تمہاری انسانیت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک تمہارا یہ حال نہ ہوجائے کہ اپنی ذاتی چیزوں میں بھی دوسرے کا حق سمجھنے لگو۔

نماز کے اندر ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کا عملی ظہور ہے ۔ اس کی اس خصوصیت نے حیرت انگیز طور پر نماز کے اندر ایک دعوتی قدر پیدا کر دی ہے ۔

چار برس پہلے کی بات ہے، میں اپنی کتاب "الاسلام" کی ترتیب کے دوران ایک سوال سے دوچار تھا، "موجودہ زمانہ تجربوں اور مشاہدوں کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان اگر مجھ سے پوچھے کہ کیا اسلام کی صداقت کو ہم تجرباتی طور پر جان سکتے ہیں، تو میرا جواب کیا ہوگا" اسی اثنا میں ۱۳ اور ۱۴ جولائی ۱۹۷۴ء کی درمیانی شب کو میں نے دہلی میں خواب دیکھا کہ میں کچھ غیر مسلموں کے ساتھ ہوں اور ان کو اسلام کی باتیں بتا رہا ہوں ۔ یہ غالباً یورپ کے کچھ لوگ تھے اور مجھ سے ٹھیک یہی سوال کر رہے تھے ۔ عجیب بات ہے کہ وہ سوال جس کو میں حالت بیداری میں حل نہ کر سکا تھا، اللہ تعالیٰ نے حالت خواب میں اس کو کھول دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس سوال کے جواب میں ان سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں: " ہاں اسلام کی تجرباتی آزمائش ممکن ہے اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ نماز کا تجربہ کریں" مخاطب کی رعایت سے خواب کی یہ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ میری نیند کھلی تو اپنا ایک جملہ مجھے لفظ بہ لفظ یاد تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا:

Without being a Muslim. you can experience Namaz

(مسلمان نہ ہوتے ہوئے آپ نماز کا تجربہ کر سکتے ہیں) جہاں تک یاد آتا ہے، اس کے بعد ان لوگوں نے وضو کیا اور میرے ساتھ نماز پڑھی۔ "نماز کا یہ تجربہ" ان کے لئے اتنا مؤثر ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

تاریخ میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ لوگ صرف نماز کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ ہند جگر خوار کے اسلام سے متاثر ہونے کا ابتدائی سبب نماز ہی تھی۔ مسلمان جب مکہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو انھوں نے وہاں ظلم اور گھمنڈ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ مسجد میں جا کر اللہ کے سامنے اپنے عجز اور بندگی کا اقرار کیا۔ ابن مندہ نے روایت کیا ہے کہ ہند نے اپنے شوہر ابو سفیان سے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔ ابو سفیان نے کہا، تم تو ابھی کل تک اسلام کی سخت مخالف تھیں۔ انھوں نے جواب دیا ہاں، مگر رات جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرے ذہن کو بالکل بدل دیا ہے:

واللہ ما رأیت اللہ تعالیٰ عبد حق عبادتہ فی هذا المسجد قبل اللیلة ، واللہ ان باتوا الا مصلین قیاما و رکوعا وسجودا	خدا کی قسم، آج کی رات سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس مسجد میں خدا کی عبادت اس طرح کی گئی ہو جیسا کہ اس کی عبادت کرنے کا حق ہے۔ خدا کی قسم یہ لوگ ساری رات نماز پڑھتے رہے۔ انھوں نے قیام اور رکوع اور سجود میں رات گزار دی۔

افریقہ کی تاریخ کا ایک مبصر لکھتا ہے :

" وسط افریقہ میں اسلام کی اشاعت بہت بڑی حد تک سیاحوں اور عرب تاجروں کے ذریعہ ہوئی۔ ان کا سب سے بڑا معجزہ جس سے افریقہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی، نماز تھا۔ جہاں یہ لوگ ایک امام کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہوئے اور ان کے چہروں سے خدا کا خوف ظاہر ہوا دیکھنے والے پگھل کر رہ گئے۔ لوگ ایک طرف اپنی ذلیل بت پرستی پر نادم ہوئے، دوسری طرف اسلامی عبادت نے ان کو اپنی طرف کھینچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف نماز نے وسط افریقہ کی اکثر آبادی کو اسلام میں داخل کر دیا۔"

Winwood Reade, Martyrdom of Man, P.32

شاہجہاں کے زمانے میں منگولوں سے مغل سلطنت کا مقابلہ پیش آیا۔ اورنگ زیب اس وقت شہزادہ تھا۔ اس کو مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے منگولوں کو سنکیانگ تک دھکیل دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت اورنگ زیب اور جے سنگھ کی فوجیں سنکیانگ کے صحرا میں منگولوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ اورنگ زیب گھوڑے سے اتر گیا اور میدان جنگ میں رومال بچھا کر نماز ادا کرنے لگا۔ منگولوں نے دیکھا کہ بادشاہ "ڈنڈ بیٹھک" کی طرح کوئی عمل کر رہا ہے۔ انھیں اس عمل پر سخت حیرت ہوئی۔ نماز کے آداب کو قریب سے دیکھنے کے لئے انھوں نے جنگ روک دی اور اورنگ زیب کا محاصرہ کرلیا۔ وہ سکون کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ اور منگول چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے حیرت کے ساتھ اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہے تھے جب بادشاہ نے سلام پھیرا تو منگولوں نے پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہے تھے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا: "میں اس خدا کی عبادت کر رہا تھا جو سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مہربان ہے۔"

بادشاہ کا یہ جواب سن کر منگول کانپ اٹھے۔ ان کا حوصلہ پست ہوگیا۔ انھوں نے یہ سوچ کر ہتھیار ڈال دیئے کہ ایسے بہادر انسان کو زیر کرنا ممکن نہیں۔ یہ ۱۶۴۷ء کا واقعہ ہے۔

محمد حسنین ہیکل (سابق ایڈیٹر الاہرام) نے لکھا ہے کہ جمال عبدالناصر جب پہلی بار روس گئے تو اس وقت کے روسی وزیر اعظم نکیتا خروشچوف نے گفتگو کے دوران نماز سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ یہ ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ کا واقعہ ہے:

"خروشچوف کو مسلمانوں کے نماز پڑھنے کا منظر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب خروشچوف کے گھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد صدر ناصر ظہر کی نماز کے لئے ماسکو کی مسجد جانے لگے تو خروشچوف نے سوالوں کی بھرمار کردی۔ ناصر جتنی دیر وضو کرتے رہے، خروشچوف بذات خود تولیہ لئے کھڑا رہا، اس نے بڑی عقیدت واحترام کا مظاہرہ کیا۔"

علم الانسان پر جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ معبود کی پرستش کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود رہتا ہے۔ کوئی بھی چیز اسے ختم نہیں کرسکتی۔ نماز اسی فطری جذبے کے اظہار کا فطری طریقہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے آداب اور طریقوں میں یہ فطری تقاضا اس طرح سمیٹ دیا گیا ہے کہ نماز میں اور انسان میں خاص مناسبت پیدا ہوگئی ہے۔ نماز انسانی فطرت کی عکاس بن گئی ہے۔ جون ۱۹۷۶ء میں ایک بار مجھے ایک غیر مسلم کے مکان پر نماز ادا کرنے کا موقع ملا ہم دو آدمی تھے۔ جب تک ہم لوگ نماز پڑھتے رہے، چھ افراد کا پورا خاندان دم بخود ہوکر ہم کو دیکھتا رہا۔ نماز سے فراغت کے بعد صاحب خانہ نے کہا: "آپ کی نماز کو دیکھ کر میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی اس میں شریک ہوجاؤں۔" اس قسم کا تجربہ مجھے اپنی زندگی میں کئی بار پیش آیا ہے۔

ہماری یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچائیں۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ اس کے آغاز کی عملی شکل کیا ہو۔ دین کو ان کے لئے بحث کا موضوع کس طرح بنایا جائے۔ موجودہ حالات میں اس کی ایک قابل عمل شکل نماز نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نماز کی "اٹھ بیٹھ" بعض لوگوں کو عجیب سی چیز معلوم ہوگی۔ جیسا کہ مکہ میں ابوطالب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کے صاحب زادے علی بن ابی طالب ابتداءً نمازی کو دیکھ کر اسلام سے متاثر ہوئے تھے، اور پھر اسلام کے سب سے بڑے جاں باز ثابت ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری اقوام تک دین کو پہنچانے کے لئے نماز نہایت کامیاب ذریعہ بن سکتی ہے۔ فطری کشش تو اس کے اندر ہمیشہ سے تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے تجرباتی اور مشاہداتی مزاج نے اس کے اندر ایک "سائنسی" اہمیت پیدا کردی ہے۔ آج کا انسان چاہتا ہے کہ کسی بات کو ماننے سے پہلے اس کو عملی شکل میں جانے، وہ اس کا ذاتی تجربہ کرسکے۔ نماز اس ضرورت کو کمال درجہ

میں پورا کرتی ہے۔ جب ایک شخص نماز میں مشغول ہو تو وہ حیرت انگیز طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ خود اس کی اندرونی مانگ کا جواب ہے۔ نماز کے مختلف اعمال میں خود اس کے اپنے روحانی تقاضے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی پوری ہستی نماز میں اس طرح شامل ہو جاتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اور حقیقت اعلیٰ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ جو شخص دور سے صرف نماز کا مشاہدہ کر رہا ہو، وہ بھی اس کی سادگی، اس کی عظمت اور انسانی وجود کے ساتھ اس کی مطابقت پر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کھلم کھلا محسوس کرنے لگتا ہے کہ معبود کی پرستش کا اس سے بہتر کوئی طریقہ ممکن نہیں۔

جہاں تک نجات آخرت کا سوال ہے آدمی کے لئے باایمان نمازی ہونا ضروری ہے، مگر اس کی کیفیات کو پانے کے لئے رسمی ایمان کی ضرورت نہیں۔ ایک شخص اگر وہ سنجیدہ ہو، ایمان لائے بغیر بھی نماز کے مقررہ طریقے میں اپنے آپ کو مشغول کر کے نماز کی کیفیتوں اور لذتوں کا ایک حصہ پا سکتا ہے۔ نماز کا یہ پہلو اس کے اندر ایک دعوتی قدر پیدا کر دیتا ہے۔ مکہ کی تاریخ اس کی عملی تصدیق بھی کر رہی ہے۔ کیونکہ مکہ میں، اسلام کے ابتدائی دور میں، قرآن کے بعد نماز ہی سب سے زیادہ لوگوں کو دین سے قریب کرنے کا ذریعہ بنی تھی۔

دوسری قوموں میں دین کی اشاعت کے لئے موجودہ زمانے میں ہمیں جو کام کرنے ہیں ان میں سے ایک کام یہ ہے کہ عالمی سطح پر مسلم نوجوانوں کا ایک حلقہ قائم کیا جائے۔ اس حلقہ کا خاص مقصد خاموش اسلامی دعوت ہو۔ اس کے افراد تمام شہروں میں ہوں اور وہ ہر دن کسی نہ کسی ایسے پارک میں جائیں جہاں غیر مسلم مرد اور عورتیں تفریح کے لئے آتے ہوں۔ وہاں وہ ایک دو گھنٹہ اس طرح گزاریں کہ ان کی گفتگو اور اٹھنے بیٹھنے میں مکمل طور پر سنجیدگی کا اظہار ہو۔ ان کے پاس قرآن کا ترجمہ ہو یا ایسی کوئی کتاب ہو جس میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے اخلاقی اور ایمانی واقعات درج ہوں۔ وہ آپس میں بیٹھ کر اس کو پڑھیں۔ بالقصد اپنی طرف سے کسی کے اوپر تبلیغ کی کوشش نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی شخص خود سے ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنا چاہے تو اس کو عزت کے ساتھ بٹھائیں۔ کوئی سوال کرے تو انتہائی نرمی اور سنجیدگی کے ساتھ اس کا جواب دیں۔ جواب معلوم نہ ہو تو صفائی کے ساتھ کہیں کہ ہمیں اس کا جواب معلوم نہیں۔ ہم تحقیق کر کے اگلے دن آپ کو بتائیں گے۔ ان کے پاس نماز اور دوسری اسلامی تعلیمات کے بارے میں چھوٹے چھوٹے کتابچے مختلف زبانوں میں ہوں جو وہ شائقین کو مفت دے سکیں۔ پارک کے اس پروگرام کا سب سے اہم جزو نماز ہو۔ اس مقصد کے لئے غالباً عصر کی نماز زیادہ موزوں ہوگی۔ سب نوجوان مل کر نماز ادا کریں۔ نماز خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ ایسا ہرگز نہ کریں کہ جلدی جلدی پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ چار رکعت نماز میں لگ بھگ ۲۰ منٹ صرف کئے جائیں۔ نماز اس طرح پڑھی جائے گویا ہم فی الواقع اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہ کام اگر کچھ برسوں تک مسلسل نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے تو اس کے غیر معمولی نتائج برآمد ہوں گے۔ مسجدوں میں نماز کی تحریک مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ اسی طرح پارکوں میں نماز کی تحریک غیر مسلموں تک دین کا پیغام پہنچانے کے لئے چل پڑے تو ہماری ذمے داری کے دونوں تقاضے پورے ہو جائیں گے۔ اور دنیا میں اگر خدانخواستہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آخرت میں انشاء اللہ ہمارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنھوں نے خلق اللہ کے سامنے حق کی گواہی دی تھی اور ایک مومن کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ یہ کام نظم کے ساتھ ہو۔ جو لوگ اس پروگرام میں شریک ہوں وہ باہم مشورہ سے ایک شخص کو "متکلم" مقرر کر لیں۔ وہی شخص کتاب پڑھے اور وہی شخص بوقت ضرورت بولے۔ بقیہ لوگ بالکل خاموش رہیں اور متکلم کے حق میں دل ہی دل میں دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے اور اس کی زبان سے وہی کلمات نکالے جس میں حق اور خیر ہو۔